قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1979

اس پرچہ میں :-

۱- یوم پاکستان پر پرویز صاحب کا خطاب

بھولے ہوئے افسانے

۲- فقہی قوانین کی دینی حیثیت —
(ایک نہایت اہم مقالہ)

آئندہ پرچہ — بیاد اقبالؒ شائع ہوگا ۔

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون نمبر	بدلِ اشتراک
۳ تین روپے	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور	سالانہ پاکستان ۔۔۔ ۳۶/ روپے غیر ممالک ۔۔۔ ۳ پونڈ
شمارہ ۴	اپریل ۱۹۷۹ء	جلد ۳۲

فہرست

۱۔ لمعات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲

۲۔ نقد و نظر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶

(اقبالؒ کا آخری معرکہ)

۳۔ "اے دوست سنائے جا بھولے ہوئے افسانے" ۔۔۔۔۔۔ ۹

(یومِ پاکستان کی تقریب پر محترم پرویز صاحب کا خطاب)

۴۔ نظامِ ربوبیت ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۰

۵۔ فقہی قوانین کی دینی حیثیت ۔۔۔۔۔۔۔ ۴۱

(وقت کا ایک اہم ترین سوال)

۶۔ طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۱

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس عارضی ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پچھلے دنوں ایران میں جو انقلاب رونما ہوا، وہ تاریخ کے اہم واقعات میں سے ہے۔ ہمیں اس کے سیاسی مالہ، وماعلیہ سے سروکار نہیں۔ اس لئے کہ وہ اس ملک اور مملکت کا داخلی معاملہ ہے۔ لیکن اس قضیہ کا ایک گوشہ ایسا ہے جس کا جائزہ لینا ہم اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ وہاں کے اقتدار کی تبدیلی کے متعلق اعلان یہ کیا گیا کہ وہ "اسلامی انقلاب" ہے۔ یوں تو اسلام کے نام سے اقوام عالم شروع ہی سے الرجک چلی آرہی ہیں لیکن آج کل وہ اس باب میں کچھ زیادہ ہی حساس ہو گئی ہیں، کیونکہ اب اسلام کا چرچا زیادہ زور شور سے ہو رہا ہے ——— اسلامی مملکت۔ اسلامی حکومت۔ اسلامی قوانین۔ اسلامی نظام۔ اسلامی انقلاب وغیرہ کی آوازیں مختلف جوانب سے سنائی دے رہی ہیں۔ اس لئے وہ ہر اس آواز، حرکت، اقدام یا تبدیلی کا جائزہ گہری دلچسپی سے لیتی ہیں جسے "اسلام" کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر ایران میں "اسلامی انقلاب" کے اعلان نے دنیا میں خاصی دلچسپی پیدا کر دی۔ غیر تو غیر، خود اپنے بھی انتظار کرنے لگ گئے کہ دیکھیں جس "اسلامی انقلاب" کا چرچا صدیوں سے سنتے آرہے تھے وہ عملی شکل میں کس طرح نمودار ہوتا ہے اور اس کے برگ و بار کیا ہوں گے؟ لیکن اس ایک ماہ کے عرصہ میں جو خبریں وہاں سے آئیں وہ اس سے زیادہ کچھ نہ تھیں کہ کل آٹھ جرنیلوں کو گولی مار دی گئی۔ آج اتنے پولیس افسروں کو حوالۂ دار و رسن کر دیا گیا۔ سابقہ حکومت کے اتنے ذمے دار عہدے داروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ ایسا کس کے حکم سے ہو رہا ہے اور یہ کچھ کون کر رہا ہے۔ رفتہ رفتہ اس قسم کی خبریں باہر آنی شروع ہوئیں کہ ایسا کچھ "خفیہ اسلامی عدالتوں" کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔ اوّل تو عدالت کے ساتھ "خفیہ" کی خصوصیت ہی عجیب سی ہے۔ پھر اس کے ساتھ اسلام کی نسبت! ان عدالتوں میں نہ باقاعدہ مقدمہ کی پیشی۔ نہ کوئی وکیل نہ اپیل۔ نہ گواہی نہ صفائی۔ کھڑے کھڑے موت کی سزا۔ اس کے فوری بعد اس پر عمل درآمد۔ سترہ مارچ تک اس طرح موت کی سزا پانے والوں کی تعداد چونسٹھ کے قریب بتائی گئی۔ انسان کشی کی یہ وارداتیں اس قدر لرزہ انگیز تھیں کہ ایران کے وزیراعظم، مہدی بازرگان کو پکار کر امام الخمینی سے کہنا پڑا کہ خدا کے لئے قتلِ بے ہنگام کے اس سلسلے کو بند کرائیے (پاکستان ٹائمز۔ ۱۶ مارچ ۱۹۷۹ء) اس سے

پہلے وہاں کے وزیر دفاع نے بھی امام الخمینی سے اسی قسم کی اپیل کی تھی۔ ان اپیلوں سے مترشح ہوا کہ اس دوران میں فوج بھی بے دست و پا تھی اور حکومت بھی بے بس۔ اقتدارِ اعلیٰ امام الخمینی ہی کو حاصل تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلے کو بند (یا کم از کم معطل) کرنے کی ہدایات نافذ کیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی فضا میں لہرائی کہ اس اعلان کے بعد اُسی قم میں جہاں سے امام الخمینی نے یہ اعلان نشر فرمایا تھا، ایک سابق پولیس افسر کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ اور اس کے ایک دن بعد مزید سات افسروں کو بھی جن میں ایک جرنیل بھی شامل تھا۔

ایران میں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے، وہی کچھ کم تاسف انگیز نہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ قابلِ افسوس یہ امر ہے کہ اتنے عرصے تک یہ کچھ ہوتا رہا لیکن مسلم ممالک میں سے نہ کسی کے ضمیر میں اس کے احساس سے ذرا سی لرزش پیدا ہوئی، نہ کسی کی زبان پر حرفِ احتجاج آیا۔ اگر کہیں سے صدائے احتجاج بلند ہوئی تو یورپ کے بعض اخبارات کی طرف سے یا اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل، والڈ ہائم کی زبان سے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ایران میں جن لوگوں کو موت کی سزا دی گئی وہ بے گناہ تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اُن سے، ماضی میں شدید جرائم کا ارتکاب بھی ہوا ہو اور ان کے خلاف سنگین الزامات بھی عائد ہوتے ہوں۔ لیکن، اسلام کا تو خیر ذکر ہی کیا کہ اس نے عدل کا کس قدر بلند معیار پیش کیا ہے، دنیا کی عام عدالتوں میں بھی اثباتِ جرم کے لئے کوئی نہ کوئی طریقِ کار متعین ہوتا ہے اور سزا کا فیصلہ اس کارروائی کے پورا کرنے کے بعد ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن ایرانی انقلاب میں تو ایسا نظر آتا ہے کہ اس باب میں کسی قاعدے قانون، یا ضابطۂ عدل کی پروا نہیں کی گئی۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ انقلابی افراتفری میں ملک میں اتنا سکون نہیں ہوتا کہ قواعد و ضوابط کی اُس طرح پابندی کی جائے جس طرح حالتِ امن میں ممکن ہے۔ لیکن ایسی صورتوں میں یہ بھی تو کیا جا سکتا ہے کہ ملزموں کو گرفتار کر لیا جائے اور جب حالات مبدل بہ سکون ہو جائیں تو پھر ان پر ضوابطِ عدل کے مطابق مقدمات چلا کر فیصلہ کیا جائے۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ سوچئے کہ دنیا "اسلامی انقلاب" کے متعلق کیا رائے قائم کریگی اور خود اسلام کے متعلق کس نتیجے پر پہنچے گی؟ ہمارے محرف تاریخ نے غیر مسلموں کے ذہن میں اسلام کا ایسا بھیانک اور ہولناک نقشہ کھینچ رکھا ہے کہ اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ انتہائی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کے ذہنوں سے اسلام کے متعلق غلط تاثرات مٹ جائیں لیکن اس قسم کے واقعات ان تمام کوششوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ یہ تھا وہ جذبہ جو ہمارے لئے واقعات کا جائزہ لینے کا محرک ہوا۔ اگر اس انقلاب کو "اسلامی" کہہ کر نہ پکارا جاتا تو یہ محض دنیا کے ممالک میں سے ایک ملک کا معاملہ ہوتا۔ لیکن اس انقلاب کو اسلامی مشہور کرنے سے بات اسلام تک جا پہنچی اور وہ مفت میں بدنام ہو گیا۔ اقوامِ عالم یہ نہیں کہیں گی کہ ایران میں ایسا کچھ ہوا۔ وہ یہی کہیں گی کہ اسلام میں یہ کچھ ہوتا ہے۔ اور جہاں بھی "اسلامی انقلاب" آیا وہاں یہی کچھ ہوگا۔

اصل یہ ہے کہ عصرِ حاضر کی مکیاولی سیاست نے ایک عجیب ابلیسی چکر چلا رکھا ہے۔ آجکل عام طور پر حکومتیں بڑی تیزی سے بدلتی رہتی ہیں ـــــ بالخصوص ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں ـــــ اس تبدیل میں ہوتا یہ ہے کہ ہر آنے والی حکومت سابقہ حکومت کے اربابِ اقتدار اور اس کے متوسلین حتیٰ کہ ان عام شہریوں کے خلاف بھی جو اُس حکومت کے وفا شعار سمجھے جائیں۔ انتقام جوئی کی مہم شروع کر دیتی ہے۔ پکڑ دھکڑ۔ مار دھاڑ۔ گرفتاریاں۔ پابندیاں۔ ضبطیاں۔ تباہیاں۔ بربادیاں۔ قید و بند حتیٰ کہ دار و رسن، اس نئی حکومت اور اس کے وابستگانِ دامن کا عام شیوہ ہو جاتا ہے اور یہ

کچھ اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ اس میں مجرم اور بے گناہ کی کوئی تمیز نہیں رہتی۔ نئی حکومت کے متعلقین یا وفاشعاروں میں سے جس نے کسی سے کوئی بدلہ لینا ہو، اس کے خلاف کسی قسم کا الزام تراش دیا اور اس کے بعد اسے دھر لیا گیا۔ یہ سلسلہ ختم نہیں ہونے پاتا کہ حکومت پھر تبدیل ہو جاتی ہے اور پھر انتقام جوئی کی وہی مہم ان لوگوں کے خلاف شروع ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں بے چارے کارکنانِ حکومت کی جان عجیب عذاب میں گرفتار ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی موجودہ حکومت کے احکام کی تعمیل نہ کریں تو یہ انہیں پھانسی کے تختے پر لٹکا دے۔ اور اگر تعمیل کریں تو آنے والی حکومت انہیں گولی سے اڑا دے! اس سے پورے معاشرے پر ایک ایسی ہولناک فضا مسلط ہو جاتی ہے جس میں کوئی فرد اطمینان کی نیند نہیں سو سکتا۔ مستقبل کی طرف سے عدمِ اطمینان سب سے شدید جانکاہ عذاب ہوتا ہے۔

انقلابات کے اس قسم کے مناظر تو عام طور پر دیکھنے میں آتے ہیں، لیکن آسمان کی آنکھ نے ایک انقلاب چودہ سو سال پہلے بھی دیکھا تھا جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ آج تک محوِ گردش اور چشم براہ ہے۔ مکہ کے قریش نے تیرہ سال تک مسلسل حضورؐ داعی اسلام اور آپ کے ضعیف و ناتواں رفقاء پر اس قدر مظالم ڈھائے کہ وہ بالآخر وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن انہوں نے انہیں وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ان کے خلاف سات سال تک لڑائیوں کا سلسلہ جاری رکھا اور ان میں ہر قسم کے جائز و ناجائز حربوں سے کام لیا گیا۔ بیس سال کے صبر آزما اور ہمت شکن تصادمات کے بعد مکہ فتح ہوا۔ حضورؐ نے اس فتح عظیم پر بدرگاہِ رب العزت سجدۂ شکرانہ سے سر اٹھایا تو دیکھا کہ وہ تمام سردارانِ قریش جنہوں نے عمر بھر ستم رانیوں اور اذیت رسانیوں میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا، پابجولاں سامنے کھڑے ہیں ——— مغلوب و مفتوح۔ خاسر و ناکام۔ اپنے انجام کے انتظار میں سر جھکائے۔ ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے اس دن اس دعوتِ حق و صداقت کی تضحیک و تحقیر کی تھی جب حضورؐ نے پہلے پہل صفا کی پہاڑی سے اللہ کا نام ان کے سامنے پیش کیا تھا اور پھر جنہوں نے اُس دن سے لے کر آج تک اپنی زندگی کی تمام توانائیاں اس نظام کی مخالفت کے لئے وقف کر رکھی تھیں۔ وہ بھی تھے جنہوں نے جتھہ بنا کر سازش کی تھی کہ شبِ ہجرت سب مل کر اس داعیٔ الی اللہ کو (معاذ اللہ) ختم ہی کر دیں۔ دوسری جانب وہ لوگ کھڑے تھے جنہوں نے بدر کے میدان میں اپنی تمام قوتوں کو اس لئے جمع کر دیا تھا کہ یہ مٹھی بھر جماعت جو خدا کا نام لیتی ہے، دنیا سے مٹا دی جائے۔ ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے اُحد کے میدان میں حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کیا اور خود حضورؐ کو بھی زخمی کر دیا۔ ان ہی میں ایک طرف وہ خاتون ہندہ بھی کھڑی تھی جس نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبایا تھا۔ یہ سب سر جھکائے آپؐ کے سامنے کھڑے تھے۔ آپؐ نے ان کی طرف دیکھا اور تہدید آمیز لہجے میں کہا کہ "تمہیں کچھ معلوم ہے کہ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں"؟ انہوں نے کہا کہ "یہ تو ہمیں معلوم نہیں۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ: اَخٌ کَرِیْمٌ وَّ ابْنُ اَخٍ کَرِیْمٍ۔ تو ہمارے ایک شریف بھائی کا بیٹا اور خود بھی شریف بھائی ہے۔" آپ نے فرمایا کہ تم نے صحیح سمجھا ہے۔ یہ کہا اور اس کے بعد ارشاد ہوا۔

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء

تم سے کچھ مواخذہ نہیں کیا جائے گا! جاؤ تم سب آزاد ہو۔

اتنا ہی نہیں۔ کچھ معزز سردار، مکے سے بھاگ گئے تھے۔ آپ نے کہلا بھیجا کہ ان سے بھی کچھ مواخذہ نہیں کیا جائیگا وہ بھی واپس آجائیں۔ ان ہی میں عرب کا مشہور شاعر عبداللہ بن زبعریٰ بھی تھا جو حضورؐ کی ہجو کیا کرتا تھا۔ اس سے بھی کچھ مواخذہ نہیں کیا گیا۔ خیبر میں جس یہودی عورت نے آپ کو زہر دیا تھا اس کی نسبت لوگوں نے حضورؐ سے دریافت بھی کیا کہ کیا اس کے قتل کا حکم ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں! میں کسی سے ذاتی انتقام نہیں لینا چاہتا۔ مکے میں مہاجرین کے مکانات اور دیگر جائدادیں تھیں جن پر قریش نے قبضہ کر رکھا تھا۔ آپ نے مہاجرین سے کہا کہ وہ اپنے حقوق سے دستبردار ہو جائیں۔

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیئے اور دیکھئے کہ وہ سامنے کون ہے؟ یہ عثمان بن طلحہ شیبی ہے جس کے پاس کعبہ کی کلید رہتی تھی۔ ہجرت کے وقت حضورؐ اس کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ ذرا کعبہ کا دروازہ کھول دو تو میں اس کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو سیراب کرلوں۔ اس نے دروازہ کھولنے سے انکار کردیا۔ آپ خاموشی سے واپس آگئے لیکن اتنا کہا کہ خیر! آج تم میری خاطر دروازہ کھولنے کے لئے تیار نہیں۔ تم مختار ہو۔ لیکن وہ وقت بھی آنے والا ہے کہ یہی کنجی میں جس کے ہاتھ میں دیدوں گا، قیامت تک کوئی اس سے چھین نہیں سکے گا۔ آج کعبہ کی وہی کنجی آپ کے ہاتھ میں تھی اور وہی شیبی سامنے کھڑا تھا۔ آپؐ نے اس سے پوچھا۔ تمہیں وہ واقعہ یاد ہے۔ اُسے یاد تھا۔

سب کی نگاہیں منتظر تھیں کہ یہ کلید متاعِ دارین کسے عطا کی جاتی ہے؟ آپؐ آگے بڑھے۔ اور معلوم ہے کہ یہ کنجی کس کے ہاتھ میں دیدی؟ اُسی عثمان شیبی کے ہاتھ میں۔ یہ کنجی آجتک اسی شیبی کی اولاد کے پاس چلی آرہی ہے۔ (معراجِ انسانیت از پرویز صفحہ ۲۸۰)

یہ تھا وہ انقلاب جسے آسمان کی آنکھ نے چودہ سو سال پہلے دیکھا تھا۔ ہمارے نزدیک تو یہ اس شانِ رحمۃ للعالمینی کا ادنیٰ سا کرشمہ تھا جس سے حضورؐ کو سرفراز فرمایا گیا تھا اور جو ہمارا جزوِ ایمان ہے لیکن غیر مسلم اربابِ دانش اس واقعہ کا اپنی نگاہوں سے جائزہ لے کر متفقہ طور پر رطب اللسان ہیں کہ تاریخ اس جیسے حسنِ تدبیر کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ اس عفو کریمانہ کا نتیجہ تھا کہ نہ صرف یہ کہ ان سابقہ دشمنوں کے دل میں اس مملکت کے خلاف بدخواہی کی رمق تک بھی پیدا نہ ہوئی۔ وہ اس کے جاں نثار بن گئے اس کی حدود فراموش وسعتیں انہی کے دست و بازو کی رہینِ منت تھیں۔ یہ ہوتا ہے غلبہ اور تسلط حاصل ہو جانے کے بعد کشادگیٔ قلب اور وسعتِ ظرف کا نتیجہ۔ حضورؐ کی اسی رحمۃ للعالمینی کو اسوۂ حسنہ بنانے کے لئے ہم سے ارشادِ باری تعالیٰ ہوا۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ۔ (۴۱/۳۴)

یاد رکھو! بھلائی اور برائی کبھی برابر نہیں ہو سکتی۔ برائی کی مدافعت بھلائی سے کرو اور پھر دیکھو کہ تمہارا جانی دشمن بھی کس طرح تمہارا جگری دوست نہیں بن جاتا!

جو تبدیلی اس طرح لائی جائے اُسے کہا جائے گا "اسلامی انقلاب" اور اُسی کے انتظار میں آسمان کی آنکھ آج تک محرومِ خواب ہے۔

(۱۸ مارچ سنہ ۱۹۷۹ء)

———(٠)———

طلوعِ اسلام کا اگلا پرچہ (بابت مئی سنہ ۱۹۷۹ء) بیادِ اقبالؒ شائع ہوگا۔ (ناظمِ ادارہ)

نقد و نظر

اقبالؒ کا آخری معرکہ

از سید نور محمد قادری

شائع کردہ :- رضا پبلیکیشنز - مین بازار - داتا صاحب دربار - لاہور

تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء کے ساتھ جو نظری تصادمات ہوئے، ان میں سب سے اہم وہ معرکہ ہے جو مولانا حسین احمد مدنیؒ (مرحوم) اور علامہ اقبالؒ (مرحوم) کے مابین، اوائل ۱۹۳۸ء میں بپا ہوا، اور جسے خود علامہؒ نے "معرکہ دینِ وطن" کہہ کر پکارا۔ طلوعِ اسلام میں اس کا تذکرہ متعدد بار آچکا ہے لیکن قارئین کی تجدیدِ یادداشت کے لئے اُسے مختصر الفاظ میں دہرا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہوا یہ کہ مولانا مدنیؒ نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ چونکہ یہ نظریہ، اسلام کے معیارِ قومیت کے خلاف کھلا ہوا چیلنج تھا اس لئے علامہ اقبالؒ تڑپ اُٹھے اور بے ساختہ وہ تین شعر کہے جو ہماری تاریخ میں ضرب المثل بن چکے ہیں۔ (یہ اشعار جن میں سے پہلے شعر کا پہلا مصرعہ ہے ——— عجم ہنوز نداند رموزِ دیں، ورنہ ..... "ارمغانِ حجاز" میں درج ہیں) اس پر مولانا مدنیؒ نے ایک لمبا چوڑا بیان شائع فرما دیا۔ علامہ اقبالؒ نے اس کا جو جواب دیا وہ قومیت کے موضوع پر روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر مولانا مدنیؒ نے اپنے بیان میں کہا کہ "میرا مقصد صرف یہ کہنا تھا کہ آجکل یورپ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ کہنا مقصود نہیں تھا کہ مسلمان بھی ایسا ہی کریں"۔ علامہ اقبالؒ نے مولانا کی اس وضاحت کو قبول کر لیا اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ لیکن علامہ موصوف کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد مولانا مدنیؒ نے ایک ضخیم پمفلٹ شائع کر دیا جس میں لکھا کہ اقبالؒ نے غلط کہا تھا۔ وطن کے اشتراک کی بنا پر مسلموں اور غیر مسلموں پر مشتمل متحدہ قومیت کی تشکیل عین مطابقِ اسلام ہے۔ اس وقت علامہ اقبالؒ دنیا میں موجود نہیں تھے اس لئے اس پمفلٹ کا جواب طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع ہوا جو اسلام کے نظریۂ قومیت کا داعی تھا۔ اس مقالہ کا جواب مولانا مدنیؒ یا ان کے متبعین میں سے کسی کی طرف سے شائع نہ ہوا۔ یہ جنوری ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔

اوائل ۱۹۷۲ء میں یوسف سلیم چشتی صاحب نے اس بحث کو دوبارہ زندہ کر دیا اور کہا کہ جب علامہ اقبالؒ نے مولانا مدنیؒ کے جواب میں اظہارِ اطمینان کر دیا تھا تو ارمغانِ حجاز کے متعلقہ اشعار کو حذف کر دینا چاہیئے۔ طلوعِ اسلام نے اپنی اشاعت بابت اپریل ۱۹۷۲ء میں، اس کا جواب شائع کیا جس میں چشتی صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ نے اس کہانی کو علامہ اقبالؒ کے "اطمینان" پر کیوں ختم کر دیا۔ اس

پمفلٹ کا کیوں ذکر نہیں کیا جسے مولانا مدنیؒ نے علامہؒ کی وفات کے بعد شائع کیا تھا۔ چشتی صاحب کی طرف سے تو اس کا کوئی جواب شائع نہ ہوا لیکن مولانا مدنیؒ کے معتقدین وقتاً فوقتاً اسے ہوا دیتے رہے ..... قارئین کے تقاضا پر ہم نے جولائی ۱۹۷۵ء میں، اپنا وہ مقالہ شائع کر دیا جو مولانا مدنیؒ کے جواب میں جنوری ۱۹۳۹ء میں، لکھا گیا تھا۔ اس سے فضا میں پھر سکوت پیدا ہو گیا۔ اس مقالہ کو (جو شروع میں پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہوا تھا)۔ فروری ۱۹۷۸ء میں، مکتبہ حبیبیہ بازار دا تا صاحب لاہور نے ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کر دیا۔ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۷۸ء میں میں اس پر تنقید شائع ہوئی۔

اواخر ۱۹۷۸ء میں، دیوبندی فرقہ کے ترجمان، ماہنامہ الرشید (ساہیوال) نے ایک خاص نمبر شائع کیا جسے "مدنی و اقبال نمبر" کہہ کر پکارا گیا (ان حضرات کی تنگ نظری ملاحظہ فرمایئے کہ اس نمبر کے ٹائیٹل اور صفحہ اوّل پر جہاں "مدنی و اقبال نمبر" لکھا گیا ہے، مدنی پر تو رحمتہ اللہ علیہ کا نشان (رح) دیا گیا ہے۔ اقبالؒ کے نام پر نہیں) پرچہ کا بنیادی موضوع علامہ اقبالؒ اور مولانا مدنیؒ کے مابین مذکورہ بالا معرکہ ہے۔ اس میں علامہؒ کے خلاف جو کچھ اور جس انداز میں لکھا گیا ہے اسے ہم دہرا نہیں سکتے۔ اس معرکہ میں چونکہ پرویز صاحب نے مولانا مدنیؒ کے پمفلٹ کا جواب لکھا تھا اس لئے انہوں نے ان کے خلاف اپنے جلے دل کے پھپھولے بڑی شدت سے پھوڑے ہیں۔ پرچے کے ابتدائیہ میں لکھا ہے کہ علامہ اقبالؒ کو:-

> حضرت علامہ سید انور شاہؒ صاحب کشمیری نے "نبوت کاذبہ مرزائیہ" کے فتنہ سے آگاہ کیا۔ اگر ڈاکٹر اقبالؒ (مرحوم) "دیوبند" سے یہ سبق حاصل نہ کرتے تو شاید اس کا انجام کیا ہوتا۔ لیکن الحمد للہ، اللہ کریم و رحیم نے ڈاکٹر اقبالؒ کو ہدایت دی اور انہوں نے "غلام احمد اوّل اور غلام احمد پرویز" دونوں کے نظریات و معتقدات پر شدید تردید اور سخت تنقید کی اور بالآخر مرزائیت کی زبردست تکفیر کی۔

سارے پرچے میں اسی قسم کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ آخر میں "مدیر بینات" کا "پرویزانِ ایں عصر اور حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ" کے عنوان سے ایک مقالہ درج کیا گیا ہے جس میں، سب و شتم کے ساتھ بہتان تراشیاں اور افترا پردازیاں اپنی انتہا تک پہنچی ہوئی ہیں۔ اور یہ سب پرویز کے اس جرم کی بنا پر کہ اس نے مولانا مدنیؒ کے پمفلٹ کا جواب کیوں لکھا تھا۔ اور وہ اب تک اقبالؒ کا ہمنوا کیوں ہے؛ ہم نے الرشید کے اس خاص نمبر کا کوئی نوٹس نہ لیا کہ یہ اس قابل تھا ہی نہیں کہ طلوعِ اسلام جیسا مجلہ اس کا نوٹس لیتا۔ لیکن سید نور محمد قادری صاحب نے زیر نظر کتابچہ (اقبالؒ کا آخری معرکہ) میں اس پر تنقید کی ہے۔ ہم اس کے مجادلانہ انداز سے تو متفق نہیں لیکن یہ اس لحاظ سے مفید ہے کہ اس میں معلومات بکثرت جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ کتابچہ ایک سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل سفید کاغذ پر شائع ہوا ہے۔ قیمت اس پر درج نہیں۔

(○)

محترم پرویز صاحب کا
درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)

لندن (انگلینڈ)

149 SUTTON COURT Rd
LONDON E-13 — 9NR.
PHONE 01 — 552-1517

لاہور میں ہر جمعہ 9 بجے صبح (فون 880800)
۲۵/بی - گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۲ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر چوہدری شاہنواز صاحب - عابد سلک انڈسٹریز
عقب اڈہ لاریاں (رانی دی جھگی) (فون 30890)

کراچی ہر جمعہ کو ۱/۲ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام - کمرہ نمبر ۲۴ - ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ - نیو چالی - کراچی ۲

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۱/۲ ۲ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت - گل روڈ سول لائنز
(بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

پشاور میں ہر جمعہ 9 بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان - آغا محمد یونس صاحب - رفیق لین صدر - بالمقابل وی آئی پی
مین گیٹ - پشاور سٹیڈیم - بارہ روڈ

گجرات میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام
بمقام ۱۲/۱/بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خان - نواب علی روڈ

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۶۶ - لیاقت روڈ

ملتان میں ہر جمعہ 9 بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ - (فون 72071)

لیہ میں ہر جمعہ بعد نماز مغرب - رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب - سرکلر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

کراچی کے خریدار متوجہ ہوں!

کتب خانہ کے اوقاتِ کار حسبِ ذیل ہیں:-
ہر روز علاوہ جمعہ:- شام ۶ بجے تا ۸ بجے شب
جمعہ:- صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے دوپہر

نیز کتب خانہ میں ادارۂ طلوعِ اسلام کی مطبوعات بھی دستیاب ہیں اور ایک کارڈ تحریر کر کے منگوائی بھی جاسکتی ہیں۔

محمد اسلام - کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام - کمرہ نمبر ۲۴ - ہارون چیمبرز / الطاف حسین روڈ - نیو چالی - کراچی ۲

باسمہ تعالیٰ

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (۷/۱۷۶)

انہیں انکی داستان سناؤ تاکہ یہ سوچیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا؛

اے دوست سنائے جا

بھولے ہوئے افسانے!

یوم پاکستان کی تقریب ــــــ منعقدہ ۲۳ مارچ ۱۹۷۹ء

پر ــــــ پرویز صاحب کا خطاب ــــــ جس سے

فراموش کردہ حقیقتیں سامنے آگئیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰

بھولے ہوئے افسانے

قوموں کی زندگی میں بعض ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو تاریخ کے دھارے کا رخ بدل دیتے ہیں۔ ہم آج اسی قسم کے ایک عظیم واقعہ کی یاد منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ اس واقعہ کی تفصیل تو طویل ہے لیکن اسے اگر سمیٹ کر بیان کیا جائے تو وہ ان چار لفظوں میں سمو جائے گی کہ یہ واقعہ "ایک عزم کا اظہار" تھا۔ دنیا میں ہر قابلِ یادگار واقعہ کی عمارت، عزم کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ عزم کے معنی کیا ہیں؟ اسے سمجھ لینا ضروری ہے۔ اپنے پیشِ نظر مقصد کی صداقت پر یقینِ محکم، قرآنِ کریم کی اصطلاح میں ایمان کہلاتا ہے۔ اور جب اس مقصد کے حصول کا ارادہ کیا جائے تو اسے عزمِ راسخ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید میں جو اعمالِ صالحہ کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ جب تک اپنے مقصد کی صداقت پر یقین کامل نہ ہو، وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ انفرادی مقاصد کی طرح اجتماعی مقاصد کی بھی یہی کیفیت ہے۔ تاریخ اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے کہ کوئی بلند مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے پیچھے ایسا مردِ آہن گداز نہ ہو جس کا عزم چٹان کی طرح محکم ہو کہ حوادثِ زمانہ کی تلاطم انگیز موجیں آئیں اور اس کے ساتھ اپنا سر ٹکرا کر خاسر و نامراد لوٹ جائیں۔ عزمِ راسخ کے ایسے ہی فولادی پیکر کے متعلق علامہ اقبال ؒ نے کہا تھا کہ:؎

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار ... با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نسازد با مزاجِ او جہاں ... می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را ... می دہد ترکیبِ نو ذرات را
می کند از قوتِ خود آشکار ... روزگارِ نو کہ باشد سازگار

ایک ایسا ہی مردِ خود دار اور پختہ کار تھا جس نے آج سے اکتالیس پہلے اپنے اس عزمِ بلند کا والہانہ اظہار کیا کہ ہم، مسلمانانِ ہند کے لئے ایک جداگانہ آزاد مملکت قائم کر کے رہیں گے۔ اور یہی ہے وہ تقریب جس کی یاد منانے کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس عزم کا اعلان مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں کیا گیا تھا۔ جب اس اجلاس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا تو مخالفت کی قوتیں چاروں طرف سے ہجوم کر کے اُمنڈ آئیں۔ مسلمانوں کے لئے ایک آزاد مملکت کا تصور تو اس سے دس سال پہلے (سنہ ۱۹۳۰ء)

میں علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا۔ لیکن اُس وقت اپنوں، بیگانوں، سب نے اسے ایک شاعر کا خواب قرار دے کر درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ لیکن اب جو انہوں نے دیکھا کہ اس خواب کے حقیقت بنانے کے ارادے ہو رہے ہیں تو مخالف قوتیں متحدہ محاذ بنا کر صف آرا ہو گئیں۔ ان کی پہلی کوشش یہ تھی کہ اس اجلاس کو منعقد ہی نہ ہونے دیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے کیا کیا حربے استعمال کئے، ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے ترکش کا آخری تیر، ۱۹ مارچ کو (یعنی اجلاس کی تاریخ انعقاد سے دو ہی روز پہلے، جبکہ اجلاس کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں) حکومت کے ساتھ خاکساروں کا ٹکراؤ تھا۔ اور اس مردِ پختہ کار کے عزم آہنی کے ساتھ تصادم یہیں سے شروع ہو گیا تھا۔ یہ پس ماندہ کاروانِ تحریکِ پاکستان اس کا عینی شاہد ہے۔ مجھے لاہور کے اس

اجلاس ہو کر رہے گا

حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ذرا پہلے مل گئی تھی جسے قائدِ اعظمؒ کے گوش گذار کرنے کے لئے میں بھاگے بھاگے ۱۰ اورنگ زیب روڈ، نئی دہلی، پہنچا۔ وہ منظر اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میں قائدِ اعظمؒ سے اس موضوع پر باتیں کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے ریسیور اٹھایا۔ مجھے اندازہ تو خود ہی ہو گیا تھا لیکن بعد میں قائدِ اعظمؒ نے بتایا کہ لاہور سے، نواب شاہنواز مرحوم ——— چیئرمین، استقبالیہ کمیٹی کا فون تھا۔ اُدھر سے کیا کہا جا رہا تھا، اسے تو میں سُن نہ سکا، لیکن اِدھر کیفیت یہ تھی کہ ایک ایک فقرہ پر، پُر شکوہ جلال کے ساتھ کوہ آسا عزم و اعتماد کا اظہار ہو رہا تھا۔ آخری فقرہ کچھ اس طرح کا تھا کہ خواہ مارشل لاء نافذ ہو یا کرفیو لگے۔ یہ اجلاس منعقد ہو گا۔ اور ہر حال میں ہو گا۔ میں پروگرام کے مطابق پہنچ رہا ہوں۔

اور وہ پروگرام کے مطابق وہاں پہنچے ——— زندگی کی بعض سعادتیں اور مسرتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جن مسرتوں سے میں اپنی زندگی میں بہرہ یاب ہوا ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مجھے کاروانِ طلوعِ اسلام کے سرخیل کی حیثیت سے قائدِ اعظمؒ کے ہم سفر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ لاہور میں حالات کس قدر توحش انگیز اور مایوس کن تھے، اس کے تذکرہ کا یہ مقام نہیں۔ میں اس وقت کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس قدر نامساعد حالات کے باوجود، وہ تاریخی اجلاس اس قدر کامیاب ہوا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اُس زمانے کے منٹو پارک اور بعد کے اقبال پارک میں مینارِ پاکستان کے مقام پر اجلاس کا وسیع و عریض پنڈال تھا اور اس سے متصل طلوعِ اسلام کا خیمہ جو اجلاس کے وقفوں کے دوران، متعلقہ مباحث کی آماجگاہ تھا ——— کیسے عصارۂ روزگار تھے وہ دن، اور کس قدر حسین ہیں ان کی یادیں!

ان حالات میں وہ ریزولیشن پاس ہوا جسے قراردادِ پاکستان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس دن، انگریزی کے لفظ (RESOLUTION) کے معانی صحیح طور پر سمجھ میں آئے۔

——— (۰) ———

اس ریزولیشن کا ردِ عمل کیا ہوا، اس کی تفصیل میں جانے کے لئے سفینہ درکار ہو گا۔ میں دو چار مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ اس کے خلاف سب سے پہلی آواز مسٹر گاندھی کی

گاندھی کی طرف سے ردِ عمل

طرف سے اٹھی۔ اُنہوں نے کہا:۔

میں پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے، بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آجکل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کروں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔

(ہندوستان ٹائمز۔ بمبئی)

مسٹر گاندھی نے جو کہا ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کا مطالبہ، اسلام کے خلاف ہے، تو یہ ان کی اپنی آواز نہیں تھی۔ یہ ان کی تمام جماعتوں اور گروہوں کی صدائے بازگشت تھی جو مطالبۂ پاکستان کو خلافِ اسلام قرار دے کر اس کی مخالفت میں خون پسینہ ایک کر رہے تھے ـــــ (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) جمیعت العلماء ہند (بالخصوص اس کے صدر، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم)۔ سرخپوش۔ احرار اسلام۔ مودودی صاحب۔ (جن کی جماعت ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی اور جو پاکستان کو "مسلمانوں کی کافرانہ حکومت بلکہ اس سے بھی بدتر" قرار دیتے تھے)، یہ سب اس تحریک کی مخالفت میں متفق اللسان تھے۔ سندھ کے خان بہادر اللہ بخش (مرحوم) نے اس تجویز کے متعلق کہا:۔

یہ اسکیم آزادئ ہند کے راستے میں روڑے اٹکاتی ہے۔

عبدالرحمٰن سرحدی (مرحوم) نے کہا:۔

یہ ہندوستان میں برطانوی تسلّط قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (مرحوم) نے فرمایا:۔

اس سے برطانوی حکومت قائم رہے گی۔

احراری راہنما، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (مرحوم) نے کہا:۔

یہ اسکیم ملک کے مفاد کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے بالخصوص نقصان رساں ہے۔ اگر کبھی اسلامستان وجود میں آیا تو احرار کے ہاتھوں آئے گا۔

دوسری طرف سیاسی لیڈروں میں سے سر سکندر حیات خان (مرحوم) جو اس زمانے میں پنجاب کے وزیر اعظم تھے، اسلامیہ کالج کے طالب علموں کو نصیحت فرما رہے تھے کہ:۔

زندگی میں تمہارا نصب العین کچھ ہی ہو لیکن یاد رکھو! تم کسی ایسی اسکیم کی تائید نہ کرنا جس کا منشا ہندوستان کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے لئے الگ خطّہ منتخب کرنا ہو۔ یہ اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف ہوگا۔

تاریخ اس المیہ کو کیسے فراموش کر سکے گی کہ سر سکندر حیات اس کمیٹی میں شامل تھے جس نے قرارداد پاکستان کا مسودہ مرتب کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ اس اسکیم کی مخالفت بھی کر رہے تھے۔ اس بدنصیب ملّت کے ساتھ اکثر ایسا ہی

ہوتا رہا ہے۔ سر سکندر کی اسی مخالفت کا نتیجہ تھا کہ ان کی پارٹی (یونینسٹ) کے سربراہ، سر چھوٹو رام کہتے تھے کہ:۔

سر سکندر کسی خالص اسلامی حکومت میں وزیرِ اعظم تو ایک طرف، کوئی ذمہ داری کا عہدہ لینے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں گے۔ پنجاب میں صرف پنجابیوں کی حکومت ہو گی۔

اور ان سب کے جواب میں، عزم راسخ کے اس آہنی پیکر کا اعلان جو انہوں نے یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، لاہور کے سیشن میں اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ:۔

لاہور کے پلیٹ فارم ہی سے مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا۔ اور آج میں اسی پلیٹ فارم سے اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان ایک ایسی منزل ہے جس تک پہنچنے سے مسلمانوں کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کے برِ اعظم میں پاکستان کے سوا کوئی دستور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پاکستان بن کر رہے گا۔ اور میں تو یہ کہوں گا کہ یہ بن چکا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:۔

مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ ایک جداگانہ مملکت کا وجود کم از کم شمال مغربی علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اور اب قائدِ اعظمؒ نے کہا کہ یوں سمجھو گویا وہ مملکت وجود میں آ چکی ہے۔ اسے کہتے ہیں عزم راسخ اور یقینِ محکم ——— چھ۔ سات برس کے جہادِ مسلسل سے یہ دعویٰ ایک ٹھوس حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آگیا۔ جب تقسیم ہند کا فیصلہ ہوا ہے تو اس وقت تحریکِ پاکستان کے مخالفین کا کرب و اضطراب، جسے بالفاظِ صحیح رقصِ بسمل یا حرکتِ ذبح ہی کہنا چاہیئے، قابلِ دید اور عبرت انگیز تھا۔ ان میں سرفہرست مخالفین کے سرغنہ، مسٹر گاندھی، کا نام تھا جنہوں نے (پاکستان کے وجود میں آنے کے تین دن پہلے) کہا:۔

اگر سارا ہندوستان جل کر راکھ ہو جائے، ہم پھر بھی مطالبۂ پاکستان منظور نہیں کریں گے۔ خواہ مسلمان اسے بزورِ شمشیر ہی طلب کیوں نہ کریں۔

(دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ مصنفہ ای۔ ڈبلیو۔ آر۔ لوبی۔ ص ۱۶۱)

تقسیم ہند کا فیصلہ، انگریز، کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے ہوا تھا۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو یہ فیصلہ ہوا اور ۱۶ جون کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حسبِ ذیل ریزولیوشن پاس کیا:۔

آل انڈیا کانگریس کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

مخالفت کا ہجوم

کانگریس کی طرف سے تقسیم ہند کے فیصلے پر دستخط پنڈت جواہر لعل نہرو نے کئے تھے۔ وہ ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ:۔

ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناحؒ کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے چلے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں ضم کر لیجئے۔

(پاکستان فیسز انڈیا۔ صفحہ 99)

تقسیم ہند کے سمجھوتے میں دوسرا فریق انگریز تھا۔ وہ بھی مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے مطالبہ کا سخت مخالف تھا۔ اور آخر تک کوشش کرتا رہا کہ ہندوستان منقسم نہ ہونے پائے۔ لیکن قائداعظمؒ نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اس کا اعتراف لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی زبانی سنیئے جو تقسیم کے زمانے میں یہاں کا وائسرائے تھا۔ ۱۹۷۵ء کے اواخر میں، اس کا ایک انٹرویو، بی۔ بی سی لندن، سے براڈ کاسٹ ہوا تھا۔ اس سے سوال کیا گیا کہ "کیا اس وقت ہندوستان کو متحد رکھنے کا کوئی امکان تھا؟" اس نے اس کے جواب میں کہا:۔

میں ہندوستان گیا ہی اس مقصد کے لئے تھا کہ اسے کسی طرح متحد رکھ سکوں۔ ہم صدیوں کے بعد اس ملک کو چھوڑ رہے تھے تو چاہتے تھے کہ اسے ایک متحد ملک کی صورت میں چھوڑ کر جائیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ایک الم انگیز حادثہ تھا جس سے ہندوستان کی قوت پارہ پارہ ہو جاتی۔ لہٰذا، میں نے اس مقصد کے لئے انتہائی کوشش کی۔ لیکن اس کی راہ میں ایک ایسا شخص حائل تھا جو پہاڑ کی طرح راہ کا روڑا بنے کھڑا تھا۔ اور وہ تھا محمد علی جناحؒ۔ صدر مسلم لیگ، جو شروع ہی سے نہ کہتا چلا گیا اور اس کے اس ارادے کو بدلنے کے لئے میری ہر کوشش ناکام رہ گئی۔ مجھے بالآخر اس کے سامنے جھکنا پڑا۔

(طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۷۶ء)

انگریز، قائداعظمؒ کے آہنی ارادے کے سامنے باصد دل ناخواستہ جھکنے کو تو جھک گیا لیکن اس سے اس کے دل پر کس قدر گہرا زخم لگا۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب تقسیم ہند کا بل منظوری کے لئے برطانوی پارلیمان میں پیش ہوا تو وہاں کے وزیراعظم، لارڈ ایٹلی نے (جو اس زمانے میں میجر ایٹلی تھے) اپنی تقریر میں کہا:۔

ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے امید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔

تشکیلِ پاکستان کے سلسلہ میں ہندو اور انگریز کے قلبی اضطراب کی ایک جھلک ہم نے دیکھ لی۔ لیکن وہ مسلمان راہ نما، جو مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش چلے آ رہے تھے، ان کی تڑپ اور خلش کا اندازہ (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی کتاب (INDIA WINS FREEDOM) سے لگ سکتا ہے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ کانگرس کے اجلاس میں تقسیمِ ہند کا مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ اس میں کانگرسی ہندو ایک ایک کر کے تقسیم کے حق میں ہو گئے اور مخالفین میں خود

(مولانا) آزاد اور خان عبدالغفار خان رہ گئے۔ غفار خان صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "ہم نے ساری عمر تمہارا ساتھ دیا اور تم ہماری وفا شعاری کا یہ صلہ دے رہے ہو کہ ہمیں بھیڑیوں کے آگے ڈال کر جا رہے ہو!" مودودی صاحب نے ایک اور راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے، وہاں ان کی مخالفت کا کوئی اثر نہیں ہوا، تو انہوں نے ان صوبوں کا رُخ کیا جہاں مسلمان اقلیت میں تھے تاکہ یہ کہہ کر پاکستان بننے کے بعد ہندوستان میں تمہارا کیا حشر ہوگا، انہیں تقسیم ہند کی مخالفت کے لئے ابھارا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس مقصد کے لئے اپریل ۱۹۴۷ء میں، مدراس۔ ٹونک اور پٹنہ میں جماعتِ اسلامی کے خصوصی اجلاس منعقد کئے۔ جہاں اپنی تقریروں میں کہا کہ:-

> ہندو اکثریت کے علاقوں میں مسلمان عنقریب محسوس کریں گے کہ جس قوم پرستی پر انہوں نے اپنے اجتماعی رویّہ کی بنیاد رکھی تھی وہ انہیں بیابانِ مرگ میں لاکر چھوڑ گئی ہے اور ان کی قومی جنگ جسے وہ بڑے جوش و خروش سے بغیر سوچے سمجھے لڑ رہے تھے، ایک ایسے نتیجہ پر ختم ہوئی ہے جو ان کے لئے تباہی کے سوا اپنے اندر کچھ نہیں رکھتی۔
>
> (روئداد جماعتِ اسلامی۔ حصہ پنجم۔ صـ۱۱۴)

لیکن (وائے افسوس کہ) ان صوبوں کے مسلمانوں نے بھی ان کی مخالفت کا کوئی اثر نہ لیا۔ بلکہ مدراس کے جلسہ میں ہنگامہ بھی ہوا۔ اس کے برعکس، پٹنہ کے اجلاس میں (مہاتما) گاندھی نے اپنی پرارتھنا چھوڑ کر شرکت کی۔

ان تمام مخالفتوں کے باوجود تقسیم ہند کا فیصلہ ہوگیا تو مخالفین کی طرف سے کھلے بندوں مخالفت کے بجائے خفیہ سازشیں شروع ہوگئیں۔ ان سازشوں میں سب سے پہلی اور مہیب سازش باؤنڈری کمیشن کا فیصلہ تھا۔ تقسیم ملک کے سلسلہ میں اصولی طور پر طے یہ پایا تھا کہ شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، پاکستان میں شامل ہوں گے۔ ان علاقوں کی حدود معین کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا۔ چاہیئے یہ تھا کہ ملک کی عملی تقسیم سے پہلے، یہ حدود متعین ہو جاتیں لیکن اس کمیشن نے اس میں دانستہ تاخیر کر دی اور حدود کا اعلان تقسیم کے بعد کیا۔ اب آہستہ آہستہ یہ راز بے نقاب ہو رہا ہے کہ یہ سب انگریز اور ہندو کی گہری سازش کے تحت کیا جا رہا تھا، اور مقصد اس سے یہ تھا کہ مسلمان اکثریت کے علاقوں میں سے بھی بعض نہایت اہم اور کلیدی رقبے ہندوستان کو دے دیئے جائیں۔ ان میں سب سے اہم رقبہ وہ تھا جس میں سے کشمیر کی طرف راستہ جاتا تھا۔ یاد رہے کہ کشمیر کی طرف ایک راستہ تو گجرات یا راولپنڈی کی طرف سے جاتا تھا۔ اور دوسرا گورداسپور کی طرف سے ـــــ گجرات اور راولپنڈی ـــــ کی طرح ضلع گورداسپور میں بھی، مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اور یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ علاقہ پاکستان میں شامل نہیں ہوگا۔ لیکن جب اس کمیشن کی طرف سے حدود کا اعلان ہوا تو یہ ضلع (اور اس قسم کے کچھ اور علاقے) ہندوستان کی نذر کر دیئے گئے۔ اس اعلان سے پہلے، اور تو اور، خود قائدِ اعظمؒ کو بھی اس کا علم نہیں تھا۔ وہ بھی مطمئن تھے کہ گورداسپور کا ضلع پاکستان کا حصّہ ہوگا۔ میں اس کا ذاتی شاہد ہوں۔ بات یوں ہوئی کہ میں اس زمانے میں

باؤنڈری کمیشن

ملازمت کے سلسلہ میں، دہلی (نئی دہلی) میں تھا اور میری والدہ (مرحومہ) اور کچھ اور افرادِ خاندان وہاں میرے پاس تھے۔ دہلی میں فسادات شروع ہو چکے تھے۔ ہم (اہلِ وفاتر) نے دہلی سے سیدھے کراچی جانا تھا لیکن کراچی میں رہائش کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ مجھے پریشانی تھی کہ ان افرادِ خاندان کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس کی بابت قائدِ اعظمؒ سے مشورہ کر لیا جائے جب میں نے اپنی پرابلم کو ان کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے فرمایا کیا تم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ تم گورداسپور کے ضلع کے رہنے والے ہو اور تمہارا قصبہ قادیان کے قریب ہے۔ میں نے کہا کہ یہ درست ہے۔ فرمایا کہ پھر تشویش کس بات کی ہے۔ باؤنڈری کمیشن کے ایک ممبر سر ظفر اللہ خان بھی ہیں جو قادیانی ہیں ضلع گورداسپور تو پاکستان ہی کا ایک حصہ ہوگا۔ اپنے اہلِ خاندان کو گھر بھیج دو اور خود سیدھے کراچی چلے جاؤ۔ چنانچہ میں نے ان کے مشورے کے مطابق اپنے ان افرادِ خاندان کو بٹالہ بھیج دیا..... جہاں سے کچھ افراد ہمارے گاؤں (رائے چک) چلے گئے۔ یہ گاؤں اس سڑک کے کنارے واقع تھا جو بٹالہ سے، سکھوں کے مقدس مرکز ڈیرہ بابا نانک کی طرف جاتی ہے۔ یہ تقسیم سے کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے۔ جب ۱۷ اگست کو میں نے کراچی میں سنا کہ گورداسپور کا ضلع ہندوستان کو دے دیا گیا ہے تو میرے دل پر جو گذری اس کا آج اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ میرے (یا میرے جیسے لاکھوں ہزاروں افراد کے) تو دل پر ہی گذری۔ لیکن وہاں کے رہنے والوں کے اپنے اوپر جو کچھ گذری اسے اب آسمان کی آنکھ کے سوا کون بتا سکتا ہے!

تقسیم کے وقت کی قیامت خیزیاں

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء (بروز جمعۃ الوداع) ہندوستان اور پاکستان کی دو الگ الگ مملکتوں کا وجود عمل میں آیا اور اس کے دو روز بعد، مسلمانوں نے آزادی کی فضا میں پہلی عید منائی۔ لیکن ہنوز نمازِ عید کی تکبیریں بھی پوری نہیں ہوئی تھیں کہ مشرقی پنجاب اور اس کی ریاستوں ——— نابھہ۔ پٹیالہ۔ کپورتھلہ۔ فرید کوٹ سے مسلمانوں کے منظم اور وسیع پیمانے پر قتلِ عام کی خبریں آنی شروع ہو گئیں۔ اس قتل و غارت گری میں ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ عورتوں کو اغوا کیا گیا۔ بچوں کو سنگینوں کی نوک پر اچھالا گیا۔ عصمت دری کے واقعات عام ہونے لگے۔ بعض شہروں میں، مردوں کو ختم کر کے، نوجوان عورتوں کے برہنہ جلوس نکالے گئے۔ چند ہی ہفتوں کے اندر اندر تقریباً پانچ لاکھ مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ اس کے بعد قتل و غارت گری کی اس آگ کا رُخ دہلی کی طرف پھرا اور ہندوستان کے دارالسلطنت میں ستمبر کا پورا مہینہ اس قسم کے قتلِ عام میں گزرا جس کی مثال تاریخ کے اوراق میں نہیں ملتی۔ ایک اندازہ کے مطابق اس خونی تماشہ میں، بھارت میں قریب دس لاکھ مسلمان قتل و غارت گری کی نذر ہو گئے، اور قریب ایک کروڑ مسلمان، انتہائی کسمپرسی کے عالم میں، کسی نہ کسی طرح جان بچا کر پاکستان پہنچ پائے۔ ان تارکینِ وطن کے ساتھ راستے میں کیا گذری، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے۔ کہ نومبر ۱۹۴۷ء میں، ضلع انبالہ کے کرآلی کیمپ سے پانچ ہزار پناہ گزینوں کا قافلہ لائل پور

مسلمانوں کا قتلِ عام

کے قریب پہنچا۔ ان میں سے دو ہزار مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے۔ ان میں پیچش کا مرض عام تھا۔ اس کیمپ میں انہیں جو آٹا کھانے کو دیا جاتا تھا، جب اس کا کیمیاوی تجزیہ کیا گیا تو اس میں نیلا تھوتھا کا زہر ملا ہوا تھا۔ ایک گاڑی ۱۱ر نومبر کو دہلی سے لاہور پہنچی تو اس میں سفر کرنے والی عورتوں اور لڑکیوں نے بتایا کہ حکومتِ ہند نے جو سپاہی ان کی حفاظت کے لئے گاڑی میں متعین کئے تھے، انہوں نے کس طرح راستے میں ان کی عصمت دری کی۔ ایک ٹرین میں قریب ڈیڑھ ہزار پناہ گزین دہلی سے آرہے تھے۔ امرتسر کے قریب ان سب کو ختم کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہندوستان میں، ہندوستانی حکومت کی طرف سے، وہاں سے آنے والے مسلمانوں کے خلاف ہو رہا تھا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے ہندوؤں کی طرف سے کیا واویلا مچایا جا رہا تھا۔ ان کی طرف سے مسلسل چیخ و پکار ہو رہی تھی کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو تباہ و برباد کر دیا ہے، ان کے گھر لوٹ لئے ہیں، ان کی عورتوں کو اغوا کر لیا ہے۔ یہ تھا وہ واویلا جس کی طرف اشارہ کرنے کے بعد، مہاتما گاندھی نے ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کی اپنی شام کی پرارتھنا کی میٹنگ میں کہا تھا کہ :-

> اگرچہ میں نے جنگ کی ہمیشہ مخالفت کی ہے لیکن اگر اس سلسلہ میں پاکستان سے انصاف حاصل کرنے کا کوئی اور طریق کارگر نہ ہوا تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ ہندوستان، پاکستان کے خلاف جنگ کرے۔

پاکستان پر حملہ کرنے کے یہ ارادے اس زمانے میں کئے جا رہے تھے جب حالت یہ تھی کہ تقسیم کے معاہدہ کی رُو سے ایک لاکھ ساٹھ ہزار ٹن سامان، پاکستان کے حصہ میں آیا تھا۔ اس میں سے ہندوستان نے (۳۱ر مارچ ۱۹۴۸ء تک) صرف (۴۷۰۳) ٹن سامان پاکستان کو دیا تھا۔ باقی سب ہڑپ کر گیا تھا۔ تقسیم کے وقت چار ارب روپیہ نقد ہندوستان میں موجود تھا جس میں سے ایک ارب روپیہ پاکستان کے حصے میں آتا تھا۔ ہندوستان نے اس رقم کے دینے سے بھی انکار کر دیا اور دسمبر ۱۹۴۷ء میں بمشکل اس پر راضی ہوا کہ پاکستان کو (۷۵) کروڑ روپیہ دے دیا جائے۔ اس میں سے بیس کروڑ روپیہ پاکستان کو پہلے مل چکا تھا لیکن ہندوستان اس معاہدہ کے باوجود کہ (۷۵) کروڑ روپیہ پاکستان کو دے دیا جائے، بقایا (۵۵) کروڑ روپیہ دبا کر بیٹھ گیا۔ اس کی وصولی کے لئے پاکستان کو ہزار جتن کرنے پڑے، اور جب بین الاقوامی دباؤ کے تحت ہندوستان کو یہ روپیہ ادا کرنا پڑا تو اس میں سے بھی پانچ کروڑ روپیہ ڈنڈی مار کر رکھ لیا۔ اس زمانے میں ہماری حالت یہ تھی کہ پاکستان کے خزانے میں، ملازمین کو تنخواہیں تک دینے کے لئے بھی پیسہ نہیں تھا۔ دفاتر کا بیشتر ریکارڈ راستوں میں تباہ کر دیا گیا تھا۔ ملازمین کی کافی تعداد ٹرینوں میں قتل ہو چکی تھی۔ جو بچے کھچے کراچی پہنچے تھے ان کے پاس نہ رہنے کو مکان تھا، نہ دفتروں میں بیٹھنے کی جگہ۔ ہم نے درختوں کے سائے تلے (PACKING CASES) پر بیٹھ کر روزمرہ کا کام کیا تھا۔

ہندوؤں کے عزائم

انگریز کے (ہندوستان سے) چلے جانے کے بعد، ہندوؤں کے عزائم کیا تھے، ان کا انکشاف، قائداعظمؒ نے دسمبر ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس

فیڈریشن کے اجلاس میں ان الفاظ میں کہا تھا:۔

ہندو مہاسبھا کے صدر، ساورکر، کی اسکیم یہ ہے کہ جب (انگریز کے چلے جانے کے بعد) میدانی بری فضائی افواج میں ہندوؤں کو (۷۵) فی صد حصہ مل جائے گا تو پھر ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کی جائیگی ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں بستے ہیں ان کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ سرحدوں پر ہندو فوج اس طرح بٹھادی جائے گی جس طرح اب برطانوی فوج متعین ہے اور یہ فوج اس کا خیال رکھے گی کہ مسلمان سر نہ اٹھا سکیں۔

ہندوؤں کے یہ عزائم اس صورت میں تھے جب ہندوستان تقسیم نہ ہوا اور فوج (۷۵) فی صد ہندوؤں کو ملے۔ لیکن تقسیم کے بعد جب فوج کا پورے کا پورا سو فی صد حصہ ہندوؤں کے پاس تھا، اس کے مشئوم ارادوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے! مثلاً راجہ مہندر پرتاپ نے کھلے الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ:۔

جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہوجاتا ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کرسکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جارہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابدی ہوگئی ہے۔ بنابریں میں اپنی حکومت کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کردے۔ (ویر بھارت۔ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۵۰ء)

اور سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر مسٹر لوہیا اتنا انتظار بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب "اگلا قدم" میں لکھا تھا:۔

ہم زیادہ عرصہ تک انتظار نہیں کرسکتے۔ شاید دو تین سال کے عرصہ ہی میں امرتسر اور پاکستان کی درمیانی حدِ فاصل مٹ جائے گی۔ ہمیں پاکستان کے زہر کو ختم کرکے تقسیم ہند کو معدوم کردینا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مصنوعی تقسیم ختم ہوجائے گی اور پاکستان اور ہندوستان پھر سے ایک ہوجائیں گے۔

پاکستان کے خلاف یہ عزائم تنہا ہندوؤں کے نہیں تھے۔ اس باب میں سکھ ان سے بھی تیز تھے۔ شروع ۱۹۴۷ء میں، جب تقسیم ہند کے متعلق محض قیاس آرائیاں ہورہی تھیں، سکھوں کے مشہور لیڈر ماسٹر تاراسنگھ نے مسلمانوں کے خلاف انتہائی شرانگیز تقریروں کا سلسلہ شروع کررکھا تھا۔ انہوں نے ۲۸ فروری ۱۹۴۷ء کو ایک تقریر میں کہا:۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہم خانہ جنگی کو کیسے روک سکتے ہیں۔ جب تک مسلمان پنجاب پر راج کرنے کی تجاویزات ترک نہیں کریں گے اس وقت تک ان سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔ سکھوں کے پاس اس قدر طاقت موجود ہے کہ وہ مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے نکال دیں۔ لیکن ہم اسی پر اکتفا کیوں کریں۔ ہم ان کو سارے پنجاب سے نکال دیں گے۔ ہم نے اس مقصد کے لئے اپنی نجی رضاکار فوج کی از سرِ نو تنظیم شروع کردی ہے۔ (طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۴۸ء)

پھر انہوں نے ۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو ایک تقریر میں کہا:۔

خالصہ پنتھ کو چاہیئے کہ وہ اب موقع کی نزاکت کو سمجھے۔ میں ہر سکھ سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنا فرض ادا کرے۔ ہم زندہ رہیں یا مرجائیں لیکن مسلمان راج کی اطاعت تسلیم نہیں کریں گے۔ خالصہ اٹھو! اپنے لنگر لنگوٹ کس لو، نازک گھڑی آپہنچی ہے۔ واہ گرو ہماری راہنمائی اور مدد کریگا۔ (ایضاً)

۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو ماسٹر تارا سنگھ، پنجاب اسمبلی ہال سے "پاکستان مردہ باد" اور "ست سری اکال" کے نعرے لگاتے اور اپنی کرپان لہراتے ہوئے نکلے اور انہوں نے اعلان کیا کہ:۔

وقت آگیا ہے کہ صرف تلوار کی طاقت کا راج ہوگا۔ سکھ تیار ہیں۔ ہم مسلمانوں کے ہوش ٹھکانے لگادیں گے۔ جب تک ہم پنجاب سے مسلم راج کا خاتمہ نہیں کردیں گے ہماری تلوار نیام میں نہیں جائے گی۔ (ایضاً)

سکھوں کے ایک اور مشہور لیڈر، گیانی کرتار سنگھ نے اپنی تقریر میں کہا:۔

آج کے دن سے ہماری مقدس جنگ شروع ہوگئی ہے۔ آج سے ایک سو سال پیشتر ہمارے زرد جھنڈے لاہور کے قلعے پر لہرا رہے تھے۔ یہی جھنڈا پھر لہرائے گا۔ یہ فیصلہ ہمارا جنگ کا کلہاڑا کرے گا کہ حکومت مسلمان کریں گے یا ہم ـــ سکھ گرو گوبند سنگھ کے نام پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔

یہ تھے سکھوں کے عزائم پاکستان کے متعلق۔

انگریز کی ملی بھگت

ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے یہ اشتعال انگیزیاں اور تباہ کاریاں تنہا ان کے عزائم کی غماز نہیں تھیں۔ ایسا کچھ انگریز کے علم اور ایما سے ہو رہا تھا جب جولائی ۱۹۴۸ء میں، پاکستان کے وزیر مالیات، ملک غلام محمد (مرحوم) لندن گئے ہیں تو انہوں نے وہاں ایک انٹرویو کے دوران کہا تھا:۔

جب تقسیم ہند کے زمانے کے حادثات کی تاریخ لکھی جائے گی تو ان کا الزام ایک حد تک بلکہ تقریباً کلاً اس شخص پر آئے گا جو اس وقت وائسرائے تھا۔ پنجاب کے فسادات ایک گہری سازش کا نتیجہ تھے۔ اس سازش میں، ایک طرف سکھوں کا وہ جنگجو طبقہ شریک تھا جو وہاں اپنا راج قائم کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف راشٹریہ سیوک سنگھ کے یہ کمینہ عزائم تھے کہ مسلمان آبادی کا صفایا کرکے پاکستان کا خاتمہ کردیا جائے۔ تقسیم سے پہلے حکومت ہند کو ان سرگرمیوں کا بخوبی علم تھا۔ لیکن ان کے سدِّباب کے لئے کچھ کارروائی نہیں کی گئی۔ وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پورا علم تھا کہ یہ فتنہ کھڑا کیا جارہا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ اسلحہ جمع کیا جارہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ سکھ کیا کررہے ہیں اور مسلمانوں کو کیسے ستایا جارہا ہے۔ اس کی سی۔آئی۔ڈی نے یہ معلومات اسے بہم پہنچادی تھیں اور اس کے رفقائے کونسل کچھ کرنے کے لئے دہائی دے رہے تھے لیکن وہ اپنی کابینہ کے مسلمان ارکان کو جھوٹی طفل تسلّیاں دیتا رہا۔

(طلوعِ اسلام ۔ اگست ۱۹۴۸ء)

یہ تھے عزیزانِ من! وہ قیامت خیز حوادث جن میں پاکستان کا وجود عمل میں آیا۔ کوئی اور ہوتا تو ہندو، سکھ اور

انگریز کی اس متحدہ سازش، اور دوسری طرف اس نوزائیدہ مملکت میں اس قدر ناسازگار حالات، سے گھبرا کر حوصلہ ہار دیتا اور سپر انداز ہو جاتا۔ لیکن اس مجاہد جانباز نے، اس جنگ میں سچ مچ اپنی جان دے دی لیکن دشمن کے سامنے سر نہ جھکایا۔ اسے کہتے ہیں یقینِ محکم اور عزم راسخ!

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

آگے بڑھنے سے پہلے، میں اس مقام پر ایک اعتراض کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب باؤنڈری کمیشن کا فیصلہ اس قدر فریب دہی اور دھاندلی پر مبنی تھا، تو قائدِ اعظمؒ نے اسے قبول کیوں کر لیا؟ اس کا جواب خود قائدِ اعظمؒ نے، ریڈیو پاکستان سے ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو نشر کردہ اپنی تقریر میں دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا:۔

ایک اعتراض کا جواب

ملک کی تقسیم اب اس انداز سے اختتام پذیر ہو گئی ہے کہ اسے مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں اس کا گہرا احساس ہے کہ ہماری آزاد مملکت کے جس طرح پر پیچھے اٹھائے گئے ہیں وہ یکسر ناانصافی پر مبنی ہیں۔ ہمیں پہلے ہی آخری حد تک سمٹا دیا گیا تھا۔ اور پھر رہی سہی کسر باؤنڈری کمیشن نے پوری کر دی۔ کمیشن کا فیصلہ غیر منصفانہ، ناقابلِ فہم اور بدنہادی پر مبنی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم نے اس کی پابندی کا عہد کر لیا ہوا ہے، لہٰذا، اس کا قبول کرنا ہم پر واجب ہو گیا ہے۔ ہم ایفائے عہد کرنے والے شریف لوگ ہیں۔ اس لئے ہمیں خواہی نخواہی اسے قبول کرنا ہوگا۔ یہ ہماری بدنصیبی سہی، لیکن جہاں ہم نے اتنی چوٹیں پہلے برداشت کی ہیں، اسے بھی ہمت، حوصلہ اور امید کے ساتھ برداشت کر لینا چاہیئے۔

مملکت کی وہ مشکلات کیا تھیں جن کے تابع اس کمیشن کا تقرر اور اس کے فیصلے کی پابندی قبول کرنی پڑی تھی، اس کی تفصیل ہمارے سامنے نہیں آئی۔ اس زمانے کے وزیرِ اعظم پاکستان نے، اپنی ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کی نشری میں البتہ اتنا کہا تھا کہ:۔

عام طور پر پوچھا جاتا ہے کہ مسلم لیگ نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کیوں قبول کی جب وہ جانتی تھی کہ اس کے نتائج کیا نکلنے والے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم سے یہ کہا گیا تھا کہ اگر ہم نے صوبائی تقسیم قبول نہ کی تو ہمیں پاکستان نہیں ملے گا۔ اگر ہم موجودہ پاکستان قبول نہ کرتے تو اس کے نتائج اتنے خطرناک ہوتے کہ مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

(طلوعِ اسلام۔ ستمبر ۱۹۴۸ء)

یہ تھیں وہ مجبوریاں جن کے پیشِ نظر اس فیصلہ کو قبول کرنا پڑا تھا ——— یا اسی قسم کا پاکستان قبول کرو اور یا ابدی طور پر ہندوؤں کی غلامی میں رہو!

(۰)

اب آگے بڑھیئے۔ ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ اس طرف ہندوؤں کی حکومت قائم ہو گئی۔ اِدھر پاکستان کی مملکت وجود میں آ گئی۔ اس پر ہر قلبِ شرافت آگیں میں یہ خیال اُبھرے گا کہ اس کے بعد پاکستان کی مخالفت ختم ہو جانی چاہیئے

تھی۔ لیکن یہ تو شرافت اور دیانت کا تقاضا تھا۔ ابلیسی سیاست کا نہیں جس کا مفاد ہی خود غرضی اور مفاد پرستی پر ہوتا ہے۔ ہندو اور انگریز ہی نہیں۔ دنیا کی اور بھی قوتیں ایسی تھیں جن کے دل میں ایک مستحکم، مضبوط اور طاقتور پاکستان کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ بالخصوص اس لئے کہ اس کے بانیوں نے بصراحت اعلان کیا تھا کہ اس مملکت میں قرآنی نظام نافذ ہوگا، اور اس نظام میں انسانوں کے خود ساختہ ہر نظام کو موت کا پیغام نظر آتا تھا۔

غیر ملکوں کے ایجنٹ

اس لئے ان قوتوں کی انتہائی کوشش تھی کہ اس مملکت کو پنپنے نہ دیا جائے۔ ان قوتوں کی میکیاولی سیاست کا حربہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دوسرے ممالک میں اپنے ایجنٹ بھیج دیتی ہیں جو وہاں مختلف حیلوں اور حربوں سے اندر ہی اندر ایسی صورت پیدا کرتے رہتے ہیں کہ وہ ملک پیہم انتشار اور خلفشار کا شکار رہے، اور اس طرح اس میں استحکام پیدا نہ ہونے پائے۔ مسلمان، مذہب پرست قوم ہے اس لئے ان ممالک کے لئے ایسے ایجنٹ تلاش کئے جاتے ہیں جو مذہب کے نام پر انتشار پھیلاتے رہیں۔ اس سلسلہ میں، حال ہی میں، ایک بڑا اہم راز بالآخر بام آیا ہے۔ جب ایران کے ہنگاموں کے نتیجہ میں، وہاں کے شاہنشاہ کو ملک چھوڑنا پڑا تو امریکی ارباب اقتدار و مشاہیر سیاست، صدر کارٹر کے گلے پڑ گئے کہ تمہاری سیاست، جاسوسی اور سراغرسانی کے انتظامات کیسے ہیں جو تمہیں معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ایران میں مذہبی تنظیموں کے رجحانات کیا ہیں اور وہ کتنی طاقت پکڑ رہی ہیں! اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ہماری پالیسی کو اس قدر شکست فاش نصیب ہوئی! اس پر اخبارات میں حسب ذیل نہایت اہم خبر شائع ہوئی۔

> واشنگٹن۔ ۲۱ر جنوری۔ امریکہ کے صدر، جمی کارٹر کے سب سے بڑے سیکیورٹی ایڈوائزر مسٹر (BREZINSKI) نے احکام جاری کئے ہیں کہ دنیا بھر میں اسلامی تحریکوں کے اثرات کا جائزہ لیا جائے۔ اس مطالعہ اور جائزہ کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کو مسلمانوں کی مذہبی تحریکوں کے اثرات کے متعلق اس سے بہتر معلومات بہم پہنچائی جائیں، جس قدر اسے ایران کے معاملہ میں حاصل ہوئی تھیں۔ (بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ ۲۲ر جنوری ۱۹۷۹ء)

آپ غور فرمائیے کہ امریکہ کو مسلمانوں کی مذہبی تنظیموں اور تحریکوں سے کیا دلچسپی ہے جو ان کے اثرات کا جائزہ لینے کے لئے وہ اس قدر عالمگیر مہم چلا رہا ہے؟ سوچئے کہ وہ کون سے مذہبی اثرات ہو سکتے ہیں جن کے متعلق صحیح معلومات نہ ہونے کی وجہ سے اس کی پالیسی کو ایران میں ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی اور دیگر اسلامی ممالک میں اس کی پیش بندی کے لئے اس قسم کے انتظامات کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی!

یہ ہے ان قوموں کا وہ طریق کار جس کی رو سے وہ ایسا انتظام کرتی ہیں کہ مسلم ممالک میں ان کی پالیسی کارفرما اور غالب رہے۔ نظر آتا ہے کہ تشکیل پاکستان کے بعد، ان قوتوں نے یہی سازش کی اور اس مملکت کے قیام کے ساتھ ہی انہوں نے یہاں اپنے ایجنٹ بھیج دیئے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، پاکستان کا وجود، یورپ اور امریکہ جیسے نظام سرمایہ داری کے حامل ممالک اور روس جیسے کمیونسٹ ملک، دونوں کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا۔ مسلمانوں کے ممالک ہیں، سرمایہ دار قوتوں کے ایجنٹوں کے لئے کامیابی کے نسبتاً زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں کیونکہ وہ مذہب کی آڑ میں کمیونسٹوں کے خلاف

مذہب کے نقاب میں

بڑی آسانی سے، اور کھلے بندوں پراپیگنڈہ کر سکتے ہیں۔ برعکس کمیونسٹوں کے، کہ خدا کے انکار کا کلنک کا ٹیکہ ان کے راستے میں بُری طرح حائل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ان ممالک میں خلفشار پیدا کرنے کے لئے اور انداز کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ جہاں تک مذہب کی آڑ میں اسلام کی تخریب کا تعلق ہے، مودودی صاحب نے اپنے ایک مقالہ ـــــ تجدید و احیاء دین ـــــ میں اسلامی تاریخ کے حوالے سے اس حقیقت کو واشگاف انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ اس اقتباس میں لفظ "جاہلیت" کے بجائے "سازش" پڑھیں تو عصرِ حاضر کی سیاست کے حوالے سے بات سمجھ میں آجائے گی۔ انہوں نے کہا ہے:-

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہیں آئی تھی بلکہ "مسلمان" بن کر آئی تھی۔ کھلے دہریئے یا مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عملِ قرآن و حدیث سے استشہاد تھا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے جاہلیت کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونا جاہلیتِ صریحہ کے مقابلہ کی بہ نسبت ہزار درجہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیئے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لئے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اور کوئی مسلمان اس کی حمایت نہ کر سکے گا۔ مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جایئے تو منافقین ہی نہیں، بہت سے اصلی مسلمان بھی اس کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں گے اور اُلٹا آپ کو موردِ الزام بنا ڈالیں گے۔ جاہلی امارت کی مسند اور جاہلی سیاست کی راہنمائی پر "مسلمان" کا جلوہ افروز ہونا۔ جاہلی تعلیم کے مدرسے میں "مسلمان" کا معلم ہونا۔ جاہلیت کے سجادہ پر "مسلمان" کا مرشد بن کر بیٹھنا، وہ زبردست دھوکا ہے جس کے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔ (ترجمان القرآن۔ بابت دسمبر ۱۹۴۰ء جنوری ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۲۸۳-۸۴)

ہماری تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ اسلام کو مسخ اور مسلمانوں کی سلطنتوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے جتنا کچھ مذہب کے نقاب میں کیا گیا ہے، کھلی دہریت یا لادینی سیاست کے حصے میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں آیا۔ ہماری ساری تباہی مذہب کی آڑ میں ہوئی ہے۔ اس وقت امریکہ کو جو اس قدر تشویش لاحق ہو رہی ہے تو اس لئے کہ وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ مسلمان ممالک میں جہاں اس کی سازش اسلام کے پردے میں کارفرما ہے، اس کے ایجنٹوں کی کارکردگی میں کمی یا کمزوری کیوں واقع ہو گئی ہے۔ وہ اس کا سبب دریافت کرنا چاہتا ہے۔

پاکستان میں ایجنٹ

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی، معاند قوتوں نے اپنے ایجنٹ یہاں بھیجنے شروع کر دیئے۔ یہ میرا قیاس نہیں، امرِ واقعہ ہے جس کی شہادت ہمارے بڑے بڑے راہ نما دیتے چلے آرہے ہیں۔ پاکستان کو وجود میں آئے ابھی چھ سات ماہ ہی ہوئے تھے کہ قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا:-

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اندر وہ لوگ موجود ہیں جو بیرونی قوتوں سے مالی امداد حاصل کر کے پاکستان کے درپئے تخریب ہیں۔ میں آپ لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ان سے ہوشیار

رہیں اور ان کے دل کش نعروں اور جاذبِ توجہ وعظوں سے فریب میں نہ آجائیں۔

{ روزنامہ ڈان - کراچی - مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۴۸ء
بحوالہ طلوعِ اسلام - بابت مارچ - اپریل - مئی ۱۹۴۸ء }

اُسی تاریخ کو کراچی میں وزیرِ خزانہ ملک غلام محمد (مرحوم) نے ایک پریس کانفرنس کے دوران کہا:-

مجھے یقین ہے کہ ملازمین کا طبقہ دل کا کھرا ہے۔ لیکن ان پر ایک ایسا طبقہ اثر انداز ہو رہا ہے جو ہماری معاشرتی زندگی کا دشمن اور بیرونِ پاکستان قوتوں کا آلۂ کار ہے۔ حکومت کو بعض ایسی جماعتوں کی سرگرمیوں کا علم ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ وہ سرکاری ملازمین کو حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کے لئے اکسائیں۔ ان میں سے بعض ہمارے معاشرتی نظام کے دشمن اور تشدد آمیز انقلاب کے حامی ہیں ..... ان میں سے بعض کے متعلق ہمیں حتمی طور پر معلوم ہے کہ وہ باہر سے ہدایات حاصل کرتے ہیں۔ کوئی حکومت بھی ایسے عناصر کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔ ہمارے ملازمین حکومت کو محتاط رہنا چاہیئے کہ وہ اس قسم کے لوگوں کے دامِ فریب کا شکار نہ ہو جائیں۔ (ڈان - ۲۳ مارچ ۱۹۴۸ء - ایضاً)

اس کے بعد وزیرِ اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں (مرحوم) نے ۱۳ اپریل کو اپنے ایک بیان میں کہا:-

بعض سازشی گروہ (ففتھ کالم) ملازمین حکومت کی مشکلات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے مقاصد براری میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اپنے مشئومہ عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ ملازمین کے دل میں کھوٹ نہیں۔ وہ انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ ملازمین میں انتشار اور سرکشی پیدا کر کے نظامِ حکومت کو مفلوج کر دیں۔ مجھے یقین ہے کہ ملازمینِ حکومت کی غالب اکثریت ان لوگوں کی فتنہ سامانیوں سے آگاہ ہے۔

(روزنامہ ڈان - $\frac{۴}{۴۸}$ ۱۳ - ایضاً)

ان بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے مئی ۱۹۴۸ء کے لمعات میں لکھا:-

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے اربابِ حکومت کی تشخیص بالکل درست ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اپریل کی اشاعت میں بصراحت لکھا تھا، دشمنانِ پاکستان کی فتنہ انگیزیوں کا علاج فقط اس قدر نہیں کہ عوام یا ملازمین سے کہہ دیا جائے کہ ان کی چالوں میں نہ آئیں ..... اگر دشمنانِ ملک و ملت سرکاری ملازمین کو گمراہ کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کی سازشوں کا جال کہیں زیادہ وسیع ہو گا۔ ہمیں خوشی ہے کہ حکومت اس قدر ہوشیار ہے کہ اسے ایسی دشمن پاکستان جماعتوں کا علم ہے لیکن ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس نے مدافعت کی کیا صورت اختیار کی ہے۔

لیکن حکومت نے نہ قوم کو کچھ بتانا مناسب سمجھا نہ بتایا۔ بایں ہمہ ہر حکومت اس دعویٰ کو بار بار دہراتی رہی کہ ملک میں پاکستان دشمن عناصر موجود ہیں۔ یہاں کی بعض سیاسی پارٹیوں کو پاکستان دشمن بیرونی حکومتوں کی طرف سے امداد ملتی ہے۔ حتیٰ کہ مسٹر اے۔ بی۔ اغوان نے جو پہلے حکومتِ پاکستان کے انٹیلیجنس بیورو کے ڈائرکٹر جنرل تھے اور

اس کے بعد وزارتِ داخلہ کے سیکرٹری، اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد یہ انکشاف کیا کہ یہ بات ان کے علم میں ہے کہ ملک کی بعض سیاسی پارٹیوں کو بیرونی ملکوں سے امداد ملتی ہے۔ اس دعوے کو میجر جنرل امراؤ خان نے (اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد) دہرایا۔ طلوعِ اسلام نے، اپنی جولائی سنہ ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں اس نہایت اہم اور نازک مسئلہ کا بھرپور جائزہ لیا اور حکومت سے پُرزور الفاظ میں کہا کہ وہ خدا کے لئے اس غریب قوم کی حالت پر رحم کھائے اور اسے بتائے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اور کون کونسے پاکستان دشمن عناصر مملکت کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ لیکن حکومت نے اسے بھی اَن سنی کر دیا۔ (طلوعِ اسلام مئی سنہ ۱۹۷۲ء)

جب بھی کسی ذمہ دار شخصیت کی طرف سے اس قسم کا اعلان ہوا، ہم نے فوراً کہا کہ اس طرح کے مبہم اعلانات سے ملک کو فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ اہلِ پاکستان کو واضح طور پر بتائیں کہ یہ سازشی افراد یا گروہ کونسے ہیں تاکہ قوم ان سے محتاط رہے۔ یا کم از کم اتنا ہی بتا دیا جائے کہ حکومت نے اس باب میں کیا چارہ جوئی کی ہے اور کس کس قسم کی حفاظتی تدابیر اختیار کی ہیں۔ لیکن کسی نے نہ ان کی نشاندہی کی اور نہ ہی یہ بتایا کہ ان کے خلاف کیا کارروائی کی گئی ہے۔ البتہ اس قسم کے بیانات کا سلسلہ بدستور جاری رہا اور ہر نئے آنے والے نے اس نظم مرصّع میں اپنی طرف سے ایک آدھ بند کا اضافہ کر دیا۔ مثلاً جنوری سنہ ۱۹۵۶ء میں، گورنر جنرل پاکستان نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا:۔

> ملک میں ایسی جماعتیں بھی ہیں جو اس پست سطح پر پہنچ چکی ہیں کہ وہ بیرونی جماعتوں سے ساز باز رکھتی ہیں اور انہیں اپنے ملک کے خلاف مسالہ فراہم کرتی رہتی ہیں۔ ایسے افراد یا جماعتوں کے استیصال کے لئے حکومت سخت سے سخت اقدام پر حق بجانب ہوگی۔
>
> (ٹائمز آف کراچی - ۲۷ ۱/۵۶ - بحوالہ طلوعِ اسلام - مارچ سنہ ۱۹۵۶ء)

اس کے دو ہی دن بعد، وزیر اعظم پاکستان نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

> ملک میں ایسے عناصر موجود ہیں جو یاس، ناامیدی اور ہراسانی کے احساس کو عام کر رہے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے استحکام اور سالمیت کو تباہ کر دیا جائے۔
>
> (ڈان - ۳۰ ۱/۵۶ - بحوالہ طلوعِ اسلام - مارچ سنہ ۱۹۵۶ء)

اوائل سنہ ۱۹۷۲ء میں، پولیس نے ہڑتال کر دی تو اس زمانے کے صدرِ مملکت نے اپنی نشری تقریر میں فرمایا:۔

> پولیس کی یہ ہڑتال، ہڑتال نہیں تھی بلکہ صاف اور سیدھے لفظوں میں یہ بغاوت تھی۔ اور بغاوت بھی ایسے وقت میں جب ہماری مسلح افواج دشمن کے سامنے کھڑی ہیں۔ اور پاکستان صحیح معنوں میں سب سے بڑے خطرناک بحران کا سامنا کر رہا ہے۔ بہرحال میں ان تلخ حقائق کی یاد تازہ کرانا نہیں چاہتا۔ میں پولیس کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس کے لئے ان کے مقاصد اور جذبات محرکہ کچھ بھی ہوں ـــــــ اور میں ان محرکات سے خوب واقف ہوں جو اس بغاوت کے پیچھے کارفرما تھے۔ (ملک میں) ایسے عناصر..... تھے جو قریب ایک ماہ سے اس کے لئے مصروفِ کار تھے یہ ہڑتال یونہی ہنگامی طور پر نہیں ہو گئی تھی۔ ایسی چیزیں اتنے وسیع پیمانے پر یونہی ہنگامی طور پر رونما

نہیں ہوجایا کرتیں۔ بہرکیف ہم اس باب کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام - اپریل ۱۹۷۲ء)

اس سے ذرا پہلے، اس وقت کے وزیرِ اطلاعات نے اخباروں کے نام ایک مکتوب میں لکھا:۔

جو عناصر محبِ وطن نہیں انہوں نے مشرقی پاکستان کے واقعات سے شہ پا کر مغربی پاکستان کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی تحریک تیز کر دی ہے۔ ان میں بعض عناصر کو بیرونِ ملک سے "دولت اور راحت" موصول ہو رہی ہے۔ یہ عناصر برِصغیر میں کنفیڈریشن کے قیام یا مغربی پاکستان کے اندر علیحدگی کی باتیں کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام - اپریل ۱۹۷۲ء)

اور آگے بڑھئے "گنگا اغوا کیس" کے سلسلہ میں، جسٹس نورالعارفین کے زیرِ صدارت انکوائری کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا:۔

یہ تمام ملزم دشمن کے ایجنٹ ہیں اور انہوں نے ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء کے درمیانی عرصہ میں بھارت اور پاکستان کے تعلقات خراب کرنے کے لئے متعدد سازشیں کیں۔۔۔۔۔۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہاں کے خفیہ راز، بالخصوص بّری، بحری اور فضائی فوج کے خفیہ راز دشمن تک پہنچائیں۔

(نوائے وقت مورخہ ۵/۴/۷۲ - بحوالہ طلوعِ اسلام - اپریل ۱۹۷۲ء)

جون ۱۹۷۲ء میں، صدرِ مملکت نے اپنی پریس کانفرنس میں اس راز کا افشا فرمایا کہ:۔

حکومت کے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہے کہ بعض اشخاص بیرونی قوتوں کے ایجنٹ کے طور پر ملک میں خلفشار اور انتشار مچاتے رہتے ہیں۔ بعض ممالک پاکستان میں سازشیں کرانے کے سلسلے مصروفِ جدّوجہد ہیں۔ ہمارے پاس اس امر کی شہادت موجود ہے لیکن میں ان ممالک کا نام نہیں لینا چاہتا۔ (پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۷/۷/۷۲ - بحوالہ طلوعِ اسلام - اگست ۱۹۷۲ء)

اس کے ایک ماہ بعد، مسٹر جے، کے، برقی نے ایک انٹرویو کے دوران فرمایا کہ:۔

میں ایک ایسا شخص ہوں جو سیاسی معاملات کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں اور قطعی اور مصدقہ طور پر سیاسی حالات اور واقعات کے ساتھ ساتھ ان اشخاص کے بارے میں بھی اظہارِ خیالات کر سکتا ہوں جو مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں خاموش رہوں۔

(جنگ - مورخہ ۴/۷/۷۲ - بحوالہ طلوعِ اسلام - اگست ۱۹۷۲ء)

اس سے ایک ماہ پہلے، سندھ کے اس زمانے کے وزیرِ اعلیٰ نے اپنے ایک بیان میں اس راز کا انکشاف کیا کہ:۔

سندھو دیش کا نعرہ لگانے والے بھارتی ایجنٹ ہیں۔ ان عناصر کی تحریک پورے طور سے پاکستان دشمن تحریک ہے اور اس تحریک کو بھارت سے مالی امداد مل رہی ہے۔ (طلوعِ اسلام - جون ۱۹۷۲ء)

اب آیئے مشرقی پاکستان کی طرف۔ مئی ۱۹۷۱ء میں، مولوی فرید احمد (مرحوم) نائب صدر جمہوری پارٹی مشرقی پاکستان نے، راولپنڈی میں بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

شیخ مجیب الرحمان۔ تاج الدین اور قمر الزمان کو ۱۹۴۷ء میں غیر ملکوں نے اپنا ایجنٹ مقرر کیا کہ وہ نظریۂ پاکستان کو ناکام بنا دیں۔ (طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

اُسی زمانے میں خان عبدالقیوم نے انکشاف فرمایا تھا کہ:۔

شیخ مجیب الرحمان نے ۱۹۶۵ء میں منعم خان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ آزادی کا اعلان کر دے۔

(طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

مشرقی پاکستان کا حادثۂ خونچکاں ایسا کرب انگیز ہے کہ اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ اس لئے میں اس سلسلہ میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ بجز اس کے کہ سازشوں کا یہ سلسلہ اتنے عرصے سے جاری تھا لیکن کسی نے قوم کو بروقت یہ نہ بتایا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے! لیکن اگر کسی نے بتایا بھی تو پھر کیا ہوا؟ مئی ۱۹۶۷ء کی بات ہے کہ ماسکو ریڈیو کے حوالہ سے اخبارات میں ایک خبر گشت لگا رہی تھی کہ سی۔ آئی۔ اے کی طرف سے یہاں کی ایک جماعت کو اس قدر روپیہ ملا ہے۔ اس پر یہاں قیاس آرائیاں شروع ہوئیں تو نیشنل عوامی پارٹی کے جائنٹ سیکرٹری، محی الدین احمد صاحب نے ڈھاکہ کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے ایک جماعت کا نام لے کر کہا کہ، سی۔ آئی۔ اے کی طرف سے اسے حال ہی میں اتنا روپیہ ملا ہے اور اس سے پہلے اتنا روپیہ۔ یہ خبر روزنامہ امروز کی ۱۴ مئی ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں شائع ہوئی۔ ہم نے حکومت سے بتاکید کہا کہ وہ اس خبر کی باقاعدہ تحقیق کرے اور ملک کو حقیقت سے آگاہ کرے۔ (طلوعِ اسلام۔ جون ۱۹۶۷ء)

لیکن صدائے برنخاست۔ یہ تو ۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ اس کے بعد بھی یہاں نام لے لے کر کہا گیا کہ فلاں لیڈر یا فلاں جماعت کو فلاں بیرونی حکومت کی طرف سے مالی امداد ملتی ہے اور فلاں لیڈر یا پارٹی فلاں حکومت کی ایجنٹ ہے لیکن نہ تو کسی نے ایسا الزام لگانے والے سے کہا کہ وہ اس کا ثبوت پیش کرے اور نہ ہی جس کے خلاف الزام لگایا گیا تھا اس نے اس کی تردید کی۔ نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ حکومت نے اس سلسلہ میں کوئی اقدام کیا ہے۔

اس سلسلہ میں کہنے کو ابھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے میرا مقصد یہ بتانا ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے یومِ اول سے آج تک یہ آوازیں برابر سنائی دیتی رہیں کہ ملک میں بیرونی قوتوں کے آلۂ کار ایجنٹ موجود ہیں جو اس میں خلفشار پیدا کرتے رہتے ہیں تاکہ یہ مملکت مستحکم نہ ہونے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مملکت کا نصف حصہ ہاتھ سے جاتا رہا اور باقی نصف جس قسم کے خطرات کے نرغے میں ہے ان سے ہر بہی خواہِ پاکستان ہراساں ہے۔ طلوعِ اسلام کی روزِ اوّل سے یہ پکار رہی کہ حکومت اس باب میں ضروری تحقیقات کے بعد قوم کو حقیقتِ حال سے آگاہ کرے اور اگر کوئی فرد یا جماعت اس قسم کی سازش میں ملوّث ہو تو اس کے خلاف مناسب کارروائی کرے۔ طلوعِ اسلام کی اس آواز کو دبانے کے لئے سازش یہ کی گئی کہ اسے اس قدر بدنام کر دیا جائے کہ اسے پڑھنا تو ایک طرف سمجھا یہ جائے کہ اسے ہاتھ لگانے سے بھی ایمان جاتا رہے گا۔ اس کے متعلق مشہور کر دیا گیا کہ یہ منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ سنت ہے۔ تین نمازوں اور نو روزوں کا قائل ہے۔ ایک نیا فرقہ بلکہ ایک نیا مذہب ایجاد کر

رہا ہے۔ یہ سب بے بنیاد الزامات ہیں لیکن ان کا پراپیگنڈہ اس تسلسل اور شد و مد سے کیا گیا اور کیا جا رہا ہے کہ کوئی شخص ان کے متعلق کسی قسم کی تحقیق کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔ انہوں نے پرویزی فرقہ، کا ایک لیبل تراش رکھا ہے ——— یعنی اس فرقہ کا جس کا وجود ہی نہیں۔ انہوں نے جس کے خلاف کچھ کہنا یا کرنا ہو اس پر اس لیبل کو چسپاں دیتے ہیں۔ اس سے وہ بیچارہ اس قدر متوحش ہو جاتا ہے کہ اس کا سارا وقت اور توانائیاں اپنی صفائیاں پیش کرنے میں ضائع ہو جاتی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ پاکستان کے خلاف بیرونی طاقتوں کی سازش کے خطرات نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور سمجھا یہ جاتا ہے کہ اسلام کے لئے خطرہ ایک ہی ہے اور وہ ہے طلوعِ اسلام۔

فرقۂ اہلِ قرآن

یہاں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے۔ ہمارے ہاں (پاکستان میں) ایک فرقہ ہے جو اہلِ قرآن کے نام سے متعارف ہے۔ وہ حدیث اور سنت کا منکر ہے۔ تین نمازوں کا قائل ہے، اور اس کی نماز بھی باقی مسلمانوں سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی الگ مسجد ہے اور وہ اپنے ان عقائد اور مسلک کی علانیہ تبلیغ کرتے ہیں۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان کے خلاف ایک لفظ بھی سننے میں نہیں آتا۔ ان کی مخالفت ہوتی ہے تو طلوعِ اسلام کی طرف سے میں نے ان کے خلاف مضامین لکھے ہیں پمفلٹ شائع کئے ہیں تو کیا یہ بات تعجب انگیز نہیں کہ ہماری مذہبی پیشوائیت ان کے خلاف تو ایک حرف تک زبان پر نہیں لاتی اور طلوعِ اسلام، جو اس فرقہ کی اس شدت سے مخالفت کرتا ہے، اس کے خلاف، منکرِ حدیث، منکرِ سنت، تین نمازوں، اور دو روزوں کا ڈھول پیٹا جاتا ہے! بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ طلوعِ اسلام کے خلاف تین نمازوں اور دو روزوں کا پراپیگنڈہ عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کا حربہ ہے۔ اس کی مخالفت کی وجہ کچھ اور ہے۔ اور یہ معلوم کرنے کے لئے آپ کو تاریخ کے کچھ ورق پیچھے کی طرف پلٹنے ہوں گے۔

جیسا کہ میں اکثر کہا کرتا ہوں، میں سنہ ۱۹۳۸ء کا پاکستانی ہوں جب علامہ اقبالؒ نے اپنے الٰہ آباد کے خطبۂ صدارت میں اس حقیقت کا اعلان کیا کہ اسلام ایک مذہب نہیں، ضابطۂ زندگی ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ اس مملکت کا نظام قرآنِ مجید کی بنیادوں پر استوار ہوگا۔ یہ اعلان خود میرے ایمان کا تقاضا تھا، اس لئے میرا اس سے ہم نوا ہونا فطری امر تھا۔ جب قائدِ اعظمؒ نے علامہ اقبالؒ کے اس تصوّر کو عملی پیکر عطا کرنے کے لئے تحریک مطالبۂ پاکستان کا اجرا کیا تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ قائدِ اعظمؒ نے ان لوگوں کی مخالفت کی مدافعت کا فریضہ میرے سپرد کیا اور اس مقصد کے لئے طلوعِ اسلام کا اجرا عمل میں آیا۔ قرآنی نظامِ مملکت میں نہ ملوکیت (یعنی سیکولرازم) باقی رہتی ہے، نہ مذہبی پیشوائیت اور نہ ہی نظامِ سرمایہ داری۔ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ واضح الفاظ میں اعلان کرتے رہتے تھے کہ ان کے پیشِ نظر قرآنی مملکت میں وہ قدامت پرستانہ اسلام رائج نہیں ہوگا جس کی اجارہ دار ہماری مذہبی پیشوائیت ہے۔ ان کا ارشاد تھا کہ اس مجوزہ مملکت کے قیام کا مقصدِ اوّلیں یہ ہے کہ اسلام کو تھیاکریسی کے چنگل سے چھڑایا

ملائیت کے خلاف

جائے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبۂ الٰہ آباد سے بھی بہت پہلے، مولانا اکبر شاہ (نجیب آبادی۔ مرحوم) کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا:۔

آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ پیشہ ور مولویوں کا اثر سرسید احمد خاں کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتووں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ انشاء اللہ شائع ہوگا۔ مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔ بہرحال اس تمام معاملے کے متعلق مفصل گفتگو ہوگی جب آپ لاہور تشریف لائیں گے۔ ہندوستان میں بالخصوص آج کل بہت سمجھ سوچ کر قدم اٹھانا ہوگا۔[1]

(انوارِ اقبالؒ۔ شائع کردہ اقبالؒ اکیڈمی۔ ص ۳۱۷)

انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک بیان میں جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:۔

تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطری، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔ (بحوالہ طلوع اسلام۔ مئی ۱۹۷۸ء)

انہوں نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس قسم کا انقلاب بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی ہوگا۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ "اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ــــ "حسبنا کتاب اللہ" ــــ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ (خطباتِ اقبالؒ)

اقبالؒ سے آگے بڑھ کر قائدِ اعظمؒ کی طرف آیئے۔ انہوں نے ۵ فروری ۱۹۳۸ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے نوجوان طالب علموں سے کہا تھا:۔

مسلم لیگ نے (کم از کم) ایک کام تو کر دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر

---

[1] "اقبالؒ اور علماء" ایک الگ، مستقل اور اہم موضوع ہے۔ اس پر میرا تفصیل سے لکھنے کا ارادہ ہے۔

کے چنگل سے چھڑا دیا ہے۔ اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خود غرضی کی مفاد پرستانہ کھیل کھیل رہے ہیں وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس لئے تمہیں اس ناخوش آئند عنصر (UNDESIRABLE ELEMENT) کی جکڑبندیوں سے آزاد کر دیا گیا جیسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔ میں یہ بات مولویوں کے پورے کے پورے طبقہ کے متعلق نہیں کہتا۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو دوسروں کی طرح آزادی پسند اور مخلص ہیں۔ لیکن ایک طبقہ ایسا ہے جو (UNDESIRABLE) ہے۔ اب جو ہم نے حکومت برطانیہ، کانگریس، رجعت پسند طبقہ اور نام نہاد مولویوں سے اپنا پیچھا چھڑا لیا ہے تو میں اپنی قوم کے نوجوانوں سے اپیل کروں گا کہ وہ ہمارے طبقہ نسواں (عورتوں) کو بھی آزادی دلائیں۔ یہ نہایت ضروری ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم مغرب کی خرابیوں کی اندھا دھند تقلید کریں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہماری مستورات نہ صرف معاشرتی بلکہ ہماری سیاسی زندگی میں بھی ہمارے دوش بدوش چل کر ہمارا ساتھ دیں۔ (تقاریر قائداعظمؒ۔ حصہ اوّل۔ ص۴۲۴)

علامہ اقبالؒ نے پاکستان کی جدید مملکت کے متعلق کہا تھا کہ اس کے نظام کے لئے ہمیں قرآن کافی ہوگا۔ قائداعظمؒ نے سنہ ۱۹۴۱ء میں، حیدرآباد (دکن) میں، اس سلسلہ میں فرمایا کہ:۔

اسلامی مملکت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔ (طلوع اسلام۔ اپریل سنہ ۱۹۷۶ء)

ان کی طرف سے اس کی وضاحت کے بعد، ان سے کہا گیا کہ جب آپ کی تحریک اسلامی بنیادوں پر استوار ہے تو مسلم لیگ زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کیوں نہیں کرتی۔ اس کے جواب میں قائداعظمؒ نے جو کچھ فرمایا وہ بڑا غور طلب ہے۔ انہوں نے کہا کہ:۔

وقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کے اصلی حدود کیا ہیں، ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے اور اپنے حلقہ سے باہر، اہلیت و استعداد کے باوجود مجھ میں یا آپ میں، یعنی اپنے سوا کسی اور میں، اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں میں ان مولوی صاحبان میں (الاّ ماشاءاللہ) نہیں پاتا۔ اور (مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔ (ایضاً)

یعنی قائدِ اعظمؒ اس خطرہ سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ چونکہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اسلام پر ہے، اگر وہ مملکت حاصل ہو گئی تو یہ لوگ اسلام کے نام کو (EXPLOIT) کریں گے اور اس میں تھیاکریسی قائم کرنے کی کوشش کریں گے، انہوں نے قوم کو اس خطرہ سے پہلے ہی دار تنگ دے دی تھی۔ انہوں نے ۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ لڑائی لڑ رہے ہیں، ہمارا نصب العین کیا ہے ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک اسٹیٹ بنانا نہیں چاہتے تھے۔

(تقاریر قائدِ اعظمؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۸۶)

یہ تھا مملکتِ پاکستان کا وہ تصور جسے علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے پیش کیا تھا اور جس کی مخالفت ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس شد و مد کے ساتھ ہوئی تھی۔ اور یہی تھی ان کی طرف سے وہ مخالفت جس کی مدافعت کا فریضہ تحریکِ پاکستان کے دوران اس خاکسار کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اُس وقت بعض دوسرے گوشوں کی طرف سے بھی ان کے اعتراضات کا جواب دیا جاتا تھا لیکن اس کی عام نشر و اشاعت کا ذریعہ طلوعِ اسلام ہی تھا۔ طلوعِ اسلام نے یہ لڑائی کس ہمت اور استقلال سے لڑی، اس کی شہادت، اس کے اُس زمانے کے فائلوں سے مل سکتی ہے جو آج بھی موجود ہیں۔ اس جنگ میں ہماری مذہبی پیشوائیت کو شکست ہوئی اور پاکستان وجود میں آ گیا۔ اس سے آپ اندازہ فرمائیے کہ طلوعِ اسلام کے متعلق ان حضرات کے جذبات کس قسم کے ہو سکتے ہیں؛ لیکن یہ تو اس جنگ میں پہلا محاذ تھا۔ اب اگلے محاذ کی طرف آیئے۔

علامہ اقبالؒ، تشکیلِ پاکستان سے بہت پہلے دنیا سے تشریف لے جا چکے تھے۔ قائدِ اعظمؒ جن حالات میں پاکستان تشریف لائے ان کا کچھ اجمالی سا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ ان حالات میں انہیں فرصت کہاں تھی کہ وہ مملکت کے آئینی پہلوؤں کے متعلق کچھ سوچ اور کر سکتے۔ لیکن، جس مسئلہ کا ابھی ابھی ذکر کیا جا رہا تھا، ان کے نزدیک اس کی اہمیت اس قدر تھی کہ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود انہوں نے اس کی وضاحت کر دی۔ انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں، اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا:۔

تھیاکریسی نہیں ہو گی

پاکستان کی مجلسِ آئین ساز نے ابھی پاکستان کا دستور مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی آخری شکل کیا ہو گی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہو گا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہو گی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(تقاریر بہ حیثیت گورنر جنرل۔ صفحہ ۶۵)

اس میں دو ایک نکات بڑے اہم ہیں (اوّل) قائدِ اعظمؒ نے یہ اعلان بہ حیثیت گورنر جنرل پاکستان کیا تھا۔ (دوم) یہ اعلان ان مذہبی عناصر کے خلاف جو تھیاکریسی قائم کرنے کے لئے پاکستان آگئے تھے، کھلا ہوا چیلنج تھا۔ اور تیسرے یہ کہ اس میں اہلِ امریکہ کو خاص طور پر مخاطب کیا گیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قائدِ اعظمؒ نے کمیونسٹوں کو بھی سخت وارننگ دی تھی لیکن اس وارننگ کی ضرورت کہ یہاں تھیاکریسی قائم نہیں ہوگی، امریکہ جیسے سرمایہ داری نظام کے حامل ملک کو بدرجہ اولیٰ تھی۔ اسی لئے انہوں نے اس کے لئے امریکہ کو بالخصوص مخاطب کیا تھا۔

قائدِ اعظمؒ مذہبی پیشوائیت کو یہ چیلنج دے کر دنیا سے تشریف لے گئے اور ان کے بعد اس محاذ آرائی کا قرعہ بارِ دیگر طلوعِ اسلام کے نام پڑا۔ یہ نزاع، پاکستان میں قرآنی نظامِ مملکت اور تھیاکریسی کے درمیان تیس سال سے جاری ہے، جس کا مقابلہ طلوعِ اسلام یکہ و تنہا۔ بے یار و مددگار۔ بے سازو سامان، محض اپنے جذبۂ ایمان کے زور پر، کئے چلا جا رہا ہے۔ اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ مذہب پرست طبقہ کی طرف سے میرے خلاف جو بے بنیاد پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے، اس کا جذبۂ محرکہ اور غرض و غائیت کیا ہے؟

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ نزاع میرے خلاف ذاتی پرخاش پر مبنی نہیں۔ یہ درحقیقت تھیاکریسی نظام اور قرآنی نظام کے درمیان نزاع ہے۔ میں تو صرف قرآنی نظام عام کرنے کا ذریعہ ہوں۔ میری مخالفت اسی جہت سے ہو رہی ہے۔ انہوں نے قرآن کی آواز پر ذرائع ابلاغ کے تمام دروازے بند کر رکھے ہیں۔ ان میں سے بعض کو روپیہ کے بل بوتے پر خریدا جاتا ہے اور جو خریدے نہیں جا سکتے انہیں مختلف حربوں سے ہراساں کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ میرا کوئی مضمون یا مکتوب کسی اخبار یا مجلّہ میں چھپ نہیں سکتا۔ ہمارے ادارے میں عید میلاد النبیؐ، جشنِ نزولِ قرآن۔ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی برسیاں اور سالگرہیں۔ یومِ پاکستان۔ یومِ آزادی۔ یومِ مجاہدین وغیرہ پر تقاریب منائی جاتی ہیں لیکن ان میں سے کسی اجتماع کی کوئی رپورٹ کہیں شائع نہیں ہوتی حتیٰ کہ میرے ہفتہ واری درسِ قرآن مجید کے اعلان کی اشاعت کے لئے بھی ہزار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا تو خیر ذکر ہی کیا، ملک میں علامہ اقبالؒ، قائدِ اعظمؒ، تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں آئے دن تقریبات منائی جاتی ہیں۔ جلسے کئے جاتے ہیں۔ ان میں کبھی آپ نے میرا نام نہیں دیکھا ہوگا، حالانکہ (میں تعلّی کے طور پر نہیں بلکہ ایک امرِ واقعہ کے اعتبار سے عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ) ملک میں اب بہت کم ایسے حضرات ہوں گے جنہوں نے پیامِ اقبالؒ، نظریۂ پاکستان، دو قومی نظریہ، اسلامی مملکت کے تصور وغیرہ کی نشر و اشاعت کو میری طرح زندگی کا مشن قرار دے رکھا ہو یا جو تحریکِ پاکستان کے رضاکار اور عینی شاہد ہوں۔ تحریکِ پاکستان کی پوری تاریخ میرے سینے میں ہے۔ کیونکہ میں اس میں شریک رہا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود خاص احتیاط برتی جاتی ہے کہ ان تقاریب میں، میں نہ بلایا جاؤں۔ یہ کچھ اتفاقیہ نہیں ہو رہا۔ ایک خاص اسکیم کے تحت منظم طور پر کیا جا رہا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے اسلام اور پاکستان کے خلاف جو سازش کی جا رہی ہے، وہ بے نقاب نہ ہونے پائے۔ لیکن یہ ان کی کوتاہ بینی اور خود فریبی ہے۔ وہ ان تدابیر سے میرے ہاتھ کو تو اپنے نقاب تک پہنچنے سے روک سکتے ہیں، زمانے کے ہاتھ کو نہیں روک سکتے۔ اس کے ہاتھ بڑے لمبے ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ ان ہاتھوں نے کس طرح انسانوں کے

خود ساختہ نظاموں کی بنیادیں متزلزل کر دی ہیں۔ اس لئے قرآن کی آواز نہ کبھی رکی ہے، نہ رکے گی ؎

پری رُو تابِ مستوری ندارند
چو در بندی، ز روزن سر برارند

خدائے علیم و بصیر نے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ: إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ...... (۹/۳۴)۔ یاد رکھو! ان علماء و مشائخ (مذہبی پیشواؤں) کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ یہ لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھا جاتے ہیں اور انسانیت کو خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں...... لیکن، سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ...... (۷/۱۴۶) "یہ لوگ، جو حق کو چھوڑ کر، اپنی کبریائی کی دھاک بٹھانا چاہتے ہیں، انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے گا اور یہ سب خدا کے قانون کی رُو سے ہوگا۔ قانونِ خداوندی کے ان دیکھے ہاتھوں کو زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے جن کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ اس کے سامنے نہ کوئی فرعون ٹھہر سکتا ہے نہ ہامان۔ نہ سامری اس کے راستے میں حائل ہو سکتا ہے نہ قارون۔ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (۶۱/۸)۔ اس نزاع میں میرے پیش نظر کوئی ذاتی مفاد نہیں۔ تشکیلِ پاکستان کے وقت، قائدِ اعظمؒ نے، از رہِ عاطفت مجھ سے فرمایا تھا کہ جس مملکت کے قیام کی خاطر تم نے اس قدر جد و جہد کی تھی وہ اب بتوفیقِ ایزدی، وجود میں آ گئی ہے اس میں تم جو منصب لینا چاہو، اس کی نشاندہی کر دو۔ میں نے ان کی اس نوازشِ خسروانہ کا دلی شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں نے تحریکِ پاکستان میں جو حقیر سی خدمات سر انجام دی تھیں وہ ایک دینی فریضہ کی ادائیگی تھی جس کا میں کوئی صلہ یا معاوضہ نہیں لینا چاہتا۔ میں جس کرسی پر ہندوستان میں بیٹھتا تھا، اسی پر پاکستان میں بیٹھوں گا۔ چنانچہ میں اسی کرسی پر بیٹھا اور اسی سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ میں نے یہاں نہ کوئی الاٹ منٹ لی۔ نہ لائسنس۔ نہ پرمٹ۔ نہ کوئی جائداد کھڑی کی۔ نہ دولت سمیٹی۔ نہ کوئی سیاسی پارٹی بنائی۔ نہ عملی سیاسیات میں حصہ لیا۔ نہ کوئی مذہبی فرقہ پیدا کیا۔ نہ عام مسلمانوں سے الگ کوئی مذہبی راہ تراشی۔ ایک سیدھے سادے مسلمان کی طرح درویشانہ زندگی بسر کی اور اس مقصد کے حصول کے لئے بساط بھر مسلسل جد و جہد کرتا رہا جسے میں، خدا کی طرف سے عائد کردہ، اپنا دینی فریضہ سمجھتا ہوں۔ یعنی پاکستان میں قرآنی نظام کا قیام۔ میں جانتا ہوں کہ قرآنی نظام کی دعوت کتنی بڑی انقلابی دعوت ہے اور اس کے داعی کی راہ کیسے ہمت شکن تضادات اور حوصلہ فرسا مشکلات سے پٹی ہوتی ہے۔ مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے کہ (جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں)۔

ایک انقلابی کی راہ

دنیا میں جو شخص مروّجہ عقائد و نظریات کی تائید کے لئے اٹھتا ہے، بغیر یہ تحقیق کئے کہ وہ صحیح ہیں یا غلط، اس کے لئے زندگی کی راہیں بڑی آسانیوں اور خوش خرامیوں کی راہیں ہوتی ہیں۔ ہر وادی کہکشاں بار اور ہر گوشہ زعفران زار۔ وہ جب پہلے دن اپنی آواز بلند کرتا ہے، تو لاکھوں کروڑوں انسانوں کو اپنا ہم نوا پاتا ہے۔ وہ، جب اور جہاں اپنے سامعین سے خطاب کرتا ہے تو ان میں سے ہر متنفس ______ یہ سمجھتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

وہ جب ان متوارث رسوم و مسالک کی تائید میں (بزعمِ خویش) دلائل و براہین پیش کرتا ہے ——— اور دنیا میں کونسا عقیدہ اور تصوّر ایسا ہے جس کے حق میں عقلِ حیلہ جُو، دلائل نہیں تراش سکتی ——— تو عوام کا گروہِ عظیم اسے اپنے عہد کا سب سے بڑا مفکّر قرار دیتا ہے۔ وہ جس طرف سے گذرے، ہزاروں انسان اس کے پیچھے چلتے ہیں۔ اس طرح وہ ان کا مسلّمہ لیڈر بن جاتا ہے۔ عقیدت منداس کے لئے دیدۂ دل فرشِ راہ کرتے اور اس کے حضور سرِ نیاز خم کرتے ہیں۔ ہر طرف سے اس پر پھولوں کی بارشیں ہوتی ہیں۔ ہر سمت سے "زندہ باد" کے فلک بوس نعروں سے اس کا استقبال کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے دنیا بھر کے سامانِ راحت و آسائش مہیا کیا جاتے ہیں۔ متبعین اس کے جلو میں اور خدام اس کی بارگاہ میں دست بستہ ایستادہ رہتے ہیں۔ اس کے سب کام بلا مزد و معاوضہ ہوتے ہیں، کیونکہ ہر متعقد اس کی خدمت کو موجبِ ہزار ثواب اور باعثِ صد ہزار سعادت سمجھتا ہے۔ وہ جس شخص یا گروہ کو اپنا حریف خیال کرتا ہے اسے کچلنے کے لئے اسے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرنا پڑتا کہ اسے باطل پرست اور فتنہ پرداز قرار دے کر اس کی مخالفت کو "جہاد فی سبیل اللہ" سے تعبیر کر دے اور اس طرح عوام کے جذبات کو اس کے خلاف مشتعل کرتا رہے۔ اس مہم کو سر کرنے کے لئے دولت کے ڈھیر اس کے قدموں میں لگ جاتے ہیں اور رضا کاروں کی جماعتیں اس کے اشارہ پر جان تک دینے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ اب وہ مفکّر کے ساتھ مجاہد بھی بن جاتا ہے اور ایک مہیب قوّت کا مالک۔ اسی قوت کے بل بوتے پر وہ دوسروں کو ڈرا کر، دھمکا کر اپنے سب کام نکالتا رہتا ہے۔ اربابِ سیاست و اقتدار (خواہ وہ ملک کے اندر ہوں، یا بیرونی سلطنتوں سے متعلق) یہ دیکھ کر کہ اس کا عوام پر کس قدر اثر ہے، اس سے روابط اور مراسم قائم کرنے میں اپنے مفاد مضمر دیکھتے ہیں۔ اس طرح اسے مذہبی راہ نما ہونے کے ساتھ سیاسی اقتدار بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اور بے پناہ دولت بھی، جس کے بل بوتے پر وہ جو جی میں آئے کرتا اور کراتا رہتا ہے۔

اس کے برعکس اس شخص کی حالت پر غور کیجئے جو عوام کی رَو میں بہنے کے بجائے زمانے کے دھارے کا رُخ صحیح سمت کی طرف موڑنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ وہ مروجہ عقائد اور موروثی نظریات میں سے ایک ایک کو لیتا ہے اور انہیں غیر متبدل معیار (قرآن مجید) پر پرکھ کر، حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دیتا ہے۔ وہ جب عوام کے کسی غلط عقیدہ یا مسلک کے خلاف لب کشائی کرتا ہے تو بھری محفل میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اس کا کوئی محرم اور کوئی ہمنوا نہیں ہوتا۔ اسے کوئی ایک ساتھی بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اس کی تائید کے لئے اس کے ساتھ کھڑا ہو جائے۔ وہ تنہا اٹھتا ہے۔ تنہا چلتا پھرتا ہے، اور اس تنہائی سے گھبرا کر اپنے ربّ سے فریاد کرتا ہے کہ:

غریبم درمیانِ محفلِ خویش — تو خود گو با کہ گویم مشکلِ خویش

ازاں ترسم کہ پنہانم شود فاش — غمِ خود را نگویم با دلِ خویش!

وہ اپنے پیغام کو لے کر، کو بہ کو، دہ بدہ، قریہ بہ قریہ پھرتا اور ہر ایک سے کہتا ہے کہ:

بیا ور دیدگر ایں جا بود سخنداںنے — غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

لیکن کوئی اس کی آواز پر کان نہیں دھرتا۔ وہ تھک کر بیٹھ جاتا اور گہری سوچ میں ڈوب کر اپنے آپ سے کہتا ہے کہ : ؎

من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر!

لیکن اس کے پیغام کی صداقت اور اس صداقت پر اس کا یقینِ محکم اسے مایوس نہیں ہونے دیتا۔ وہ پھر اٹھتا ہے اور باندازِ دگر اپنا پیغام دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ کچھ لوگ اس کے قریب آتے ہیں اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ لیکن وہ، انہیں متنبہ کرتا ہے کہ اس راستے پر سوچ سمجھ کر قدم رکھنا۔ میری ہم نوائی دنیا بھر سے لڑائی مول لینے کے مرادف ہے۔ وہ ان سے کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ : ؎

زمرغانِ چمن نا آشنایم | بشاخِ آشیاں تنہا سرایم
اگر نازک دلی از من کراں گیر | کہ خونم می تراود از ندایم!

وہ اپنے پیغام کو اسی طرح دہرائے چلا جاتا ہے تاآنکہ وہ (پیغام) فضا میں اپنے نقوش مرتب کرنے شروع کر دیتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کو خطرہ محسوس ہوتا ہے جو اس کی اس انقلابی دعوت میں اپنی مفاد پرستیوں کی تباہی دیکھتے ہیں۔ وہ اس کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ مخالفتوں کے اس ہجوم کے مقابلہ میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے اور اپنے اللہ سے دعا کرتا ہے کہ : ؎

با پرستارانِ شب دارم ستیز | باز روغن در چراغِ من بریز

حضرات انبیاء کرام ؑ دنیا میں سب سے بڑے داعی انقلاب ہوتے تھے۔ وہ ہر حاضر و موجود کو، خواہ اس کے ساتھ کتنی ہی مقدس نسبتیں کیوں نہ وابستہ ہوں، تنقیدی نگاہ سے دیکھ کر، مستقل اقدار کی کسوٹی پر پرکھتے اور جو کچھ اس پر پورا نہ اترتا اس کے متعلق اپنی قوم (حتیٰ کہ خود اپنے اہل خاندان تک) سے برملا کہہ دیتے کہ : مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (21/52) وہ انہیں کھلا ٹوک کر کہتے کہ : اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ۔ (21/67)

سلسلۂ انبیاء کرام ؑ، نبی اکرم ؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔ لیکن جس آسمانی انقلاب کی طرف وہ دعوت دیتے تھے، وہ قرآن کی شکل میں قیامت تک باقی رہے گا۔ لہٰذا اب دعوتِ انقلاب علیٰ منہاجِ نبوت کے معنی ہیں، دعوت اِلَی القرآن۔ رسول اللہ نے جب قرآن کی طرف دعوت دی تو ہر طرف سے اس آواز کی مخالفت ہوئی۔ انہی مخالفین میں وہ اہل کتاب بھی تھے جن کے لئے یہ آواز نئی نہیں تھی۔ انہیں حضور ؐ بار بار کہتے کہ : مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ (46/9) میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں نہ ہی جو کچھ میں کہتا ہوں وہ کوئی نئی بات ہے۔ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا (2/135) یہ اسی مسلک کی طرف دعوت ہے جسے تمہارے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیم ؑ نے پیش کیا تھا۔ اس لئے لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ (2/41) تمہیں تو یہ زیب نہیں دیتا کہ تم ہی سب سے پہلے اس دعوت سے انکار کر دو اور اس کی مخالفت پر اتر آؤ۔ لیکن ان دلائل و براہین کو کون سنتا تھا؟ انہوں نے مخالفت کی اور جی بھر کر مخالفت کی۔

حضورؐ کے بعد، بعینہٖ یہی صورت ہر اس داعیِ انقلاب کے ساتھ پیش آئے گی جو قرآن کی طرف دعوت دینے کے لئے اٹھے گا۔ وہاں مخالفت سابقہ اہلِ کتاب کی طرف سے تھی۔ اب وہی مخالفت خود مسلمانوں کی طرف سے ہوگی، حالانکہ یہ اٹھتے بیٹھتے اسی قرآن کو زندگی کا واحد ضابطۂ قوانین اور خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی آخری اور مکمل ہدایت بھی کہتے ہیں۔ یہ بات بظاہر بڑی تعجب انگیز اور حیرت افزا نظر آتی ہے کہ ایک قوم ایک کتاب پر ایمان کی مدعی ہو لیکن جب اسے اس کتاب کی طرف آنے کی دعوت دی جائے تو وہ اس دعوت کی شدید ترین مخالفت کرے۔ اس مخالفت میں ہراول دستہ مذہبی پیشواؤں (احبار و رہبان) کا ہوتا ہے۔ کیونکہ آسمانی انقلاب کی زد سب سے پہلے انہی پر پڑتی ہے۔

ان حالات میں آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ایک داعیِ الی القرآن کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ کس طرح ان تمام آسائشوں اور راحتوں سے محروم رہ جاتا ہے جو روشِ عامہ کی تائید کرنے کی صورت میں پکے ہوئے پھل کی طرح از خود اس کی جھولی میں آگرتی تھیں۔ وہ صرف ان آسائشوں اور راحتوں ہی سے محروم نہیں رہتا بلکہ ہر طرف سے ہدفِ طعن و تشنیع اور موردِ سب و شتم بھی بنتا ہے۔ یہ سب اس جرم کی پاداش میں کہ: قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ۔ وہ کہتا ہے کہ رب صرف اللہ ہے۔ اور اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷:۳) صرف اسی کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل ہوا ہے۔ اس کے سوا کسی کارساز کا اتباع مت کرو۔

میری دعوت یہی ہے اور اسی کی پاداش میں میرے ساتھ وہ کچھ ہو رہا ہے جو ہر داعیِ انقلاب کے لئے مقدّر ہے۔

لیکن میں نے نہ اس مخالفت کا کبھی کوئی اثر لیا۔ نہ اس سے پریشان ہوا۔ نہ مایوس۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ انسان پریشان ان مشکلات کی وجہ سے ہوتا ہے جو کسی ایسے پروگرام کی پیدا کردہ ہوں جسے اس پر زبردستی لاد دیا گیا ہو اور اس سے پیچھا چھڑانا اس کے لئے ممکن نہ ہو۔ جس مسلک کو انسان خود، اپنی مرضی سے اختیار کرے اور جس وقت جی چاہے اسے چھوڑ سکے، اس کے راستے میں آنے والی مشکلات اور مصائب سے تنگ پڑنے یا زچ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، قرآنی نظام کا قیام میرا جزوِ ایمان اور میری زندگی کا وہ مقصد اور مشن ہے جسے میں نے اپنے دل و دماغ کی کامل رضامندی سے، فریضۂ خداوندی کے طور پر، بطیبِ خاطر اختیار کر رکھا ہے۔ اس لئے اس کی راہ میں آنے والی مشکلات سے حوصلہ ہارنے یا دل برداشتہ ہونے کے معنے کیا؟ یہاں تو ہر مشکل کے سامنے آنے کے وقت ردِّ عمل یہ ہوتا ہے کہ: انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ میں نے اپنے آپ کو اللہ کے مقرر کردہ مقصد کے حصول کے لئے وقف کر رکھا ہے اس لئے میرا ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھے گا۔ یہاں تو کیفیت یہ ہے کہ.....

بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد ـــــ پھر، اس کے ساتھ میرا کوئی ذاتی مفاد بھی وابستہ نہیں کہ اس کے نقصان کے احساس سے مجھے پریشانی لاحق ہو۔ اس لئے، اجازت دیجئے کہ میں، اس مردِ قلندر کی ہم نوائی میں، جس نے صدرِ اوّل کے بعد پہلی مرتبہ قرآنی نظامِ زندگی کا تصور پیش کیا تھا، یہ کہنے کی

جرأت کروں کہ :-

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش — میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش — خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش — میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پُرسوز و خوش اندیش و نکوبین و کم آمیز — آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

نہ پریشان نہ مایوس

باقی رہا کہ میں مایوس نہیں ہوں' تو اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ ہم مایوس اس وقت ہوتے ہیں جب ہم اپنے اوپر از خود ایسی ذمہ داری عائد کر لیتے ہیں، جو درحقیقت ہماری ذمہ داری نہیں ہوتی اور جب وہ ذمہ داری پوری نہیں ہوتی تو ہم مایوس ہو جاتے ہیں۔ ہم تو ایک طرف، اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ سے فرمایا تھا کہ: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ (2/272) "تیرا فریضہ اتنا ہے کہ تو انہیں بتا دے کہ صحیح راستہ کونسا ہے؛ انہیں اس راستے پر چلانا تیری ذمہ داری نہیں"۔ میری ذمہ داری یہ نہیں کہ میں یہاں قرآنی نظام قائم کرکے دکھاؤں۔ میری ذمہ داری اتنی ہے کہ میں بتادوں کہ قرآنی نظام کیا ہے اور وہ کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ جہاں تک میری اس ذمہ داری کا تعلق ہے، میں مطمئن ہوں کہ میں نے اسے، اپنی بساط کے مطابق پوری طرح ادا کیا ہے (اور کئے چلا جا رہا ہوں)۔ میں گذشتہ پچاس سال سے، قرآنی فکر کے سمجھنے اور سمجھانے میں مصروف ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک سانس اس کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اور اس احساس سے میرا سرِ نیاز بدرگاہِ ربّ العزّت جھک جاتا ہے کہ میں نے قرآنِ خالص کے سلسلہ میں انفرادی طور پر جتنا کچھ مرتب اور مدوّن کر دیا ہے ہماری ہزار سالہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ فکر قوم کے سمجھنے سوچنے والے طبقہ کے دل و دماغ میں جس کثرت اور سرعت سے گھر کئے جا رہی ہے۔ اس کی مجھے توقع ہی نہ تھی۔ جب میں نے یہ آواز بلند کی تھی تو میں بالکل تنہا تھا۔ اور اب بتوفیقِ ایزدی یہ آواز پاکستان ہی میں نہیں، بیرونی ممالک تک کے گوشے گوشے میں وجہِ فروغِ دیدہ و دل ہو رہی ہے۔ کیا یہ حقیقت مایوسی پیدا کرنے کا باعث ہے یا تازہ تمناؤں اور نئے ولولوں کی بہار آفریں دنیا کے دروازے کھولنے کا موجب! میری عمر بھر کی جگر کاویوں اور دلسوزیوں کا جذبۂ محرکہ ایک شدید احساس ہے جو مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی اس فریضہ کی ادائیگی سے غافل نہیں ہونے دیتا۔ قرآنِ کریم نے اپنے مخصوص محاکاتی انداز میں بتایا ہے کہ قیامت کے دن، ہر قوم بارگاہِ خداوندی کے سامنے سے گذرے گی اور اس کا سربراہ اس کا تعارف کرائے گا۔ جب ہماری قوم کی باری آئے گی تو ہمارے رسول (نبی اکرمؐ) ہمارا تعارف ان الفاظ میں کرائیں گے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔ (25/30)

اور رسول کہے گا۔ اے میرے رب! یہ میری قوم ہے جس نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔

یہ آیۂ جلیلہ جب بھی میرے سامنے آتی ہے تو میرے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ میں تڑپ اٹھتا ہوں۔ میری انتہائی آرزو اور کوشش ہوتی ہے کہ قرآن کے ساتھ وابستہ رہ کر زندگی گذاروں۔ شاید اس طرح میرا شمار اُس گروہ میں نہ ہو جس کے متعلق حضورؐ نبی اکرم خدا سے اس طرح شکایت کریں گے۔ یہ ہے وہ احساس جو مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی تمسک بالقرآن سے غافل نہیں ہونے دیتا۔

اب رہا یہ سوال کہ پاکستان میں قرآنی نظام کا قیام عمل میں نہیں آسکا، تو یہ چیز (معاذ اللہ) قرآنی نظام کی ناکامی کی دلیل نہیں۔ قرآنِ مجید کے متعلق قرآن بھیجنے والے نے کہہ رکھا ہے کہ یہ ضابطۂ حیات، مکمل بھی ہے۔ غیر متبدل بھی اور محفوظ بھی۔ اور

یہ قرآن کی ناکامی نہیں

اسے تمام نظامہائے عالم پر غالب آکر رہنا ہے۔ انسانوں کے خود ساختہ نظاموں کو اصولی طور پر تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے —— ملوکیت یا سیکولرازم (یعنی انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی کھلی کھلی حکومت) تھیاکریسی (یعنی انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی خدا کے نام کی آڑ میں حکومت)۔ اور نظامِ سرمایہ داری۔ دنیا رفتہ رفتہ ان تینوں نظاموں سے تنگ آتی جا رہی ہے اور ان خود ساختہ ستونوں کو خود اپنے ہاتھ سے منہدم کئے چلی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر ستون کے گرنے سے، قرآنی نظام کے لئے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہمیں قرآنی نظام کی کامیابی کے متعلق، کسی خاص خطۂ زمین یا تاریخ کے کسی خاص دور کے حوالے سے نہیں سوچنا چاہیئے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ عالمگیر انسانیت کا رُخ کس سمت کو ہے۔ اس خدا نے جو اقوام و ملل کے اختصاص سے بے نیاز اور زمان و مکان کی حدود و قیود سے بلند و بالا ہے، واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ:۔

اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)

اگر تم نے قرآن سے اعراض برتا تو تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

قرآن کریم نے یہاں کہا ہے کہ جو قوم تمہاری جگہ لے گی (یعنی قرآنی نظام قائم کرنے کی اہل ہوگی) وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ اُن انسانوں کی شکل و صورت تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ شکل و صورت کے اعتبار سے تو سب انسان کم و بیش ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس قوم کے نظریاتِ زندگی، نصب حیات، مقاصد و مطالب، نصب العین۔ (ایک لفظ میں) ان کا ایمان اور اس ایمان پر متفرع، ان کی سیرت و کردار تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہزار برس سے ہم پر ذہنی جمود اور فکری تعطل طاری ہے، علم و بصیرت، غور و تدبر، فکر و شعور، تحقیق و تجسس، ہم پر سب حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی ہے اور ہم ٹھٹھرے ہوئے وہیں کے وہیں کھڑے ہیں۔ ہمارے ہاں سب سے بڑی خوبی اسے تصوّر کیا جاتا ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے کس قدر مشابہ ہیں۔ ہمارے اسلاف کا یہ ماڈل اس ماحول میں مرتب ہوا تھا جو ملوکیت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ ہم ابھی تک اسی ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں، اور اس پر فخر کرتے ہیں۔

قرآن، آخرت (مستقبل) کو سامنے رکھنے کی تاکید کرتا ہے اور ہم ماضی کے دھندلکوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ: "من استوٰی یوماہ فھو مغبون"۔ جس کے دو دن ایک جیسے گذر گئے، سمجھو کہ وہ تباہ ہو گیا۔ اور ہم ہیں کہ ہماری صدیاں ایک جیسی گذر چکی ہیں اور ہم مست ہیں۔ یہ زندگی، انسانی سطح کی نہیں، حیوانی سطح کی ہے۔ بکری آج بھی ویسی ہی ہے جیسے دس ہزار سال پہلے تھی۔ لیکن قرآن کی رو سے، انسان کی ہر نسل کو سابقہ نسل سے ایک قدم آگے ہونا چاہئیے۔ اس طرح کہا جا سکے گا کہ ہماری موجودہ نسل، سابقہ نسل کے مثل نہیں۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد میں نے سب سے پہلے یہ آواز بلند کی تھی کہ ہم، (سابقہ نسل کے افراد) جیسے کچھ بھی وہاں سے آئے ہیں، ان میں تبدیلی آنا مشکل ہے۔ ان کے ذمے تو اتنا فریضہ عائد کرو کہ یہ اس مملکت کی سرحدوں کو محفوظ رکھ سکیں۔ لیکن ہماری نئی نسل کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کرو کہ وہ "ہماری مثل" نہ ہو۔ ان کی ذہنیت، ان کا تصورِ حیات۔ ان کا نصب العینِ زندگی۔ یعنی ان کا ایمان۔ قرآن کے قالب میں ڈھل کر ہم سے مختلف ہو۔ وہ ایسی قوم ہوگی جو (قرآن کے الفاظ میں) "ثُمَّ لَا يَكُونُوٓا۟ أَمْثَٰلَكُم" کے معیار پر پوری اترے گی۔ وہ قرآنی نظام قائم کرنے کی اہل قرار پائے گی تو ہماری جگہ لے سکے گی۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو خدا کے اٹل قانونِ استبدالِ قومی کے مطابق ہمیں مٹا دیا جائے گا اور ہماری جگہ کوئی ایسی قوم لے لے گی جو ہمارے جیسی نہیں ہوگی۔ میں تیس سال تک برابر یہی چیختا پکارتا رہا، لیکن میری کسی نے نہ سنی۔ بلکہ یوں کہئیے کہ قرآنی نظام کے مخالفین نے ایسا انتظام کیا کہ میری یہ آواز کسی کے کان میں پڑنے نہ پائے۔ اور اگر پڑ جائے تو وہ اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھے۔ وہ ڈرے کہ اس سے اس کا ایمان نہ خراب ہو جائے۔ تیس برس کا عرصہ گذر گیا اور ہم اپنے جیسی (بلکہ بعض گوشوں میں اپنے سے بھی بدتر) قوم پیدا کرتے چلے گئے۔ ان حالات میں یہاں قرآنی نظام قائم ہونے کا کیا امکان ہو سکتا ہے۔ ہم تو غیر مسلموں کے مقابلہ میں بھی قرآن سے زیادہ دور ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام قائم نہ ہوا تو اس سے انتہائی صدمہ ہوگا۔ لیکن خدا کا قانونِ مکافات انسانی جذبات سے متاثر نہیں ہوتا۔ "لَا يَخَافُ عُقْبَٰهَا" (91/15)۔ اپنے قانون کو نافذ کرتے وقت خدا کا ہاتھ کانپا نہیں کرتا۔ اس نے اس خطۂ زمین کو ہمیں مرحمت کرتے وقت واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ: "لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ" (10/14) ہم دیکھیں گے کہ حصولِ مملکت کے بعد تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔ اگر ہم خدا کی اس نعمتِ کبریٰ کے ناسپاس گذار ہونگے تو وہ ہم سے اس نعمت کو چھین لے گا اور ہماری جگہ کوئی ایسی قوم لے لے گی جو اس کی اہل ہوگی۔ اقبالؒ کے سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے الفاظ ہیں: ؎

زخمۂ ما بر نے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از امتاں آمد غنی — از زمان و از مکاں آمد غنی

حق اگر از پیشِ ما بردار دش
پیشِ قومے دیگرے بگزاردش!

متعین طور پر تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کونسی قوم ہے جس کے حصے میں یہ سعادت آئے گی لیکن اقوامِ مغرب کا اضطراب اس حقیقت کا غماز ہے کہ وہ حاضر و موجود سے تنگ آ کر کسی نظامِ نو کی تلاش میں ہیں۔ حاضر و موجود سے بیزار ہونا وہ کفر بالطاغوت (باطل سے بیزاری) ہے جسے قرآن نے ایمان باللہ کی منزلِ اوّلیں قرار دیا ہے۔ وہ قومیں اپنے اپنے فرسودہ مذاہب سے بہت پہلے سے بیزار ہو رہی ہیں۔ ان کے متعلق وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکی ہیں کہ:-

یہ تمام مذاہب ٹوٹی ہوئی کشتیاں ہیں (جنہیں حوادثِ زمانہ کے طوفانوں نے) ٹکڑے ٹکڑے کر کے ساحل پر پھینک دیا ہے۔ یہ سب اپنے اپنے تقدس کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اطمینانِ خویش نے (جو درحقیقت فریبِ نفس کا دوسرا نام ہے) ان کے متبعین کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے۔ (جس کی وجہ سے انہیں حقیقت نظر ہی نہیں آ سکتی) ان کے عقائد و نظریات کے زنگ نے ان کے افکار و اعمال کے قبضوں کو اس قدر جام کر دیا ہے کہ ان میں اب حرکت کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یہ لوگ قدامت پرستوں کے کوڑوں سے اس قدر ڈرے سہمے رہتے ہیں کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سمجھ اور سوچ سے کام لینے کی جرأت کر سکیں۔

(PROF: HOCKING — LIVING RELIGIONS AND A WORLD FAITH)

انسانوں کے وضع کردہ مذہب کے بندھنوں سے آزاد ہونے کے بعد جس قسم کے نظام کا تصور ان کے ضمیر میں پہلو بدل رہا ہے، اس کا اظہار وہ کچھ اس قسم کے الفاظ میں کرتے ہیں:-

(وہ نظام) انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب بڑی خصوصیت یہ ہو گی کہ وہ عالم گیر ہو گا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا جو مشرق و مغرب کی تمام تعلیمات کا مہیمن ہو گا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ حیات دے گا جو علومِ سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اُسی نظام کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔

(ERICH FROMM — THE SANE SOCIETY)

ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام انہیں قرآن عظیم کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ یہ حقیقت نشیدِ جانفزا ہے کہ اب وہاں کے اربابِ فکر و نظر نے اپنی توجہات کا رُخ قرآن کی طرف مبذول کیا ہے۔ اس سے امید بندھتی ہے کہ وہاں کوئی ایسی قوم اُبھرے جو "ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ" کے معیار پر پوری اُترے۔ وہی قوم انسانیت کی نجات کی ضامن ہو گی۔

محبت کرنے والے کم نہ ہونگے تیری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

پرویز

ایک مُدّت کے انتظار کے بعد عصرِ حاضر کی نہایت اہم تصنیف

نظامِ رُبُوبیّت

شائع ہوگئی۔

(یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے)

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے، نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے۔ جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟

مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ:۔

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے، کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں۔

ان کے برعکس: ـــــــــــــ

(۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسان کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:۔

- مارکس نے کس طرح یہ اعتراف کیا کہ اس کا نظام ناقابلِ عمل ہے۔
- ماؤزے تنگ کا فلسفۂ اضداد کی بنیادیں کس طرح نااستوار ہیں۔
- ربٰو (سود) کا مسئلہ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے۔
- زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

ـــــ کتاب، آفسٹ کی چھپائی ہیں، ولایتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔

ضخامت سوا چار سو صفحات ـــــ سنہری جلد ـــــ قیمت فی جلد پچاس روپے

ـــــ محصول ڈاک ـــــ تین روپے

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور — ملنے کا پتہ — مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وقت کا اہم ترین سوال

فقہی قوانین کی دینی حیثیت

فقہی قوانین کی دینی حیثیت

انسان فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کے لئے مل جل کر رہنا ضروری ہے۔ انفرادی زندگی میں (یعنی جہاں ایک فرد تنہا زندگی بسر کرے) کوئی تصفیہ طلب معاملہ پیدا نہیں ہوتا لیکن اجتماعی زندگی میں اس قسم کے معاملات کا نمودار ہونا ناگزیر ہے۔ جب دو انسانوں میں کوئی نزاع پیدا ہو جاتے تو اس کے لئے کسی ثالث کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے متنازع فیہ معاملہ میں تصفیہ کرے۔ جو صورت دو افراد میں پیدا ہو سکتی ہے، وہ عام معاشرہ میں بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے بھی کسی ثالث کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کے پورا کرنے کے لئے انسانوں نے اپنے لئے ایک نظام وضع کیا جسے نظام حکومت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی شکل تو قبائلی یا پنچایت کی سی تھی لیکن اس کے بعد جب اس نے وسعت اختیار کر لی تو کسی با قاعدہ ثالث کی ضرورت پیش آئی۔ اس ثالث کو حاکم کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی فیصلہ کرنے والا۔ اسے شخصی حکومت کہتے ہیں۔ یعنی وہ حکومت جس میں ایک فرد کا حکم قول فیصل قرار پاتا تھا اور اس کی نافرمانبرداری مستوجب سزا ہوتی تھی۔ بالفاظ دیگر اس میں جملہ افراد معاشرہ اپنے ہی جیسے ایک انسان کے محکوم ہوتے تھے۔ انسانی تمدنی زندگی آگے بڑھی تو احکام کی جگہ قانون کا تصور پیدا ہوا۔ احکام اور قانون میں فرق یہ تھا کہ حکم تو وقتی ہوتا تھا لیکن قانون سے مراد یہ تھی کہ جب تک اسے بدلا نہ جائے وہ کارفرما رہے۔ اس وقت سوال یہ پیدا ہوا کہ اس قسم کے قوانین کون وضع کرے۔ قانون کی حکمرانی کے زمانہ میں یہ جو ہم نظام حکومت کی مختلف شکلیں دیکھتے ہیں تو یہ درحقیقت انسان کی اسی کوشش کے مختلف مظاہروں کا نام ہے جس کی رو سے وہ طے کرتا تھا کہ قانون سازی کے اختیارات کسے حاصل ہونے چاہئیں۔ اس کی آخری شکل نظام جمہوریت ہے۔ لیکن عہد کہن کی شخصی حکومت ہو یا عصر حاضر کی جمہوریت، اس میں انسان بہرحال اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے فیصلوں کا محکوم رہتا ہے۔

قرآن کا انقلابی تصور

۲۔ انسان کی ان تمام کوششوں کے برعکس اللہ تعالیٰ نے ایک دین عطا فرمایا جس کی بنیاد احترام انسانیت اور شرف آدمیت پر تھی۔ اس نے کہا کہ ہر انسان، انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔ اس لئے یہ چیز شرف انسانیت کے منافی ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو۔ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کا کوئی گروہ، وہ کسی کا حکم ہو یا انسانوں کا وضع کردہ قانون۔ بات ایک ہی ہے۔ اس میں انسان دوسرے انسانوں کا محکوم ہوتا ہے اور یہ چیز احترام آدمیت کے منافی ہے۔ اس نے یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ،

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ

كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ....

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ اسے ضابطۂ قوانین، اختیارِ حکمرانی، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ کسی انسان کو نہیں، خواہ وہ شخصی حکومت کی شکل میں ہو اور خواہ قانون سازی کے اداروں کی صورت میں۔ حتیٰ کہ نبی تک کو بھی اس کا حق حاصل نہیں۔ شرفِ انسانیت کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہے کہ حکم دینے یا قانون صادر کرنے کا حق انسانوں سے بالا کسی ہستی کو ہو۔ اس ہستی کو اللہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم کر لیں انہیں مومن — یعنی خدا پر ایمان لانے والے کہہ کر پکارا جاتا ہے گا۔ بالفاظ دیگر ایمان باللہ کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں، صرف خدا کو حاصل ہے۔

کتاب اللہ کی حاکمیت

اس ایمان باللہ کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ ہمیں کہیں دکھائی دیتا ہے نہ وہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ ہم اپنے کانوں سے اس کی بات سن سکتے ہیں تو اس کے احکام کی اطاعت کس طرح کی جاسکے؟ اس کا جواب خدا نے اسی آیت میں دے دیا جس کا آدھا حصہ ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ اس کا باقی حصہ یوں ہے:

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ

نہیں کسی انسان کی محکومیت اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ محکومیت صرف خدا کی اختیار کرنی چاہیے اور اس کا ذریعہ وہ کتاب ہے جسے اس نے نازل کیا ہے۔ جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے احکام و مطالب تم اپنے دل و دماغ میں جاگزیں کرتے ہو۔

آپ غور کیجیے کہ قرآنِ کریم نے کیسے بلیغ انداز سے اس بات کو سمجھا دیا کہ خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا قابلِ عمل طریقہ کیا ہے۔ آپ غور کیجیے کہ آج، اس دور میں جسے انتہائی تہذیب و تمدن کا زمانہ کہا جاتا ہے، مبنی بر عدل حکومت کا تصور یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے ایک آئین مرتب کرتی ہے۔ اس آئین کو کتاب کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔ پھر اس آئین کے مطابق قوانین وضع کئے جاتے ہیں اور وہ قوانین بھی کتابوں کی شکل میں عام کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر متنازعہ فیہ معاملہ کے تصفیہ کے لئے ان کتابوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر حکمرانی کتاب کی ہوتی ہے۔ کتاب کی حکمرانی میں کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے اس کتاب کو مرتب کیا تھا۔ وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آتے۔ ہم ان کی کوئی بات نہیں مانیں گے جب تک وہ ہمیں خود حکم نہ دیں۔ کوئی اس کا تقاضا نہیں کرتا۔ غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی کہ حکمرانی کتاب (ضابطۂ قوانین) کی ہوتی ہے اور اس کی موجودگی میں اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ صاحبِ کتاب خود ہمارے سامنے آکر حکم دے تو پھر ہی اس کی اطاعت کی جائے۔ کتاب کی اطاعت درحقیقت کتاب دینے والے کی اطاعت ہوتی ہے۔ لہٰذا، اللہ کی اطاعت کی عملی شکل اس کی کتاب کی اطاعت ہے، اور اللہ پر ایمان کا عملی مفہوم اس کی کتاب پر ایمان لانا ہے۔ جو شخص خدا کی کتاب پر ایمان نہیں لاتا، اس کا خدا پر ایمان لانا بھی قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص اس کی کتاب کی محکومیت اختیار نہیں کرتا وہ خدا کی حاکمیت سے انکار کرتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کی حکومیت اختیار نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر کہلاتے ہیں۔

(۲) جس کتاب کی حکومیت اختیار کی جانی مقصود ہو، یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنی ہر بات کو واضح طور پر بیان کرے۔ اس میں کوئی ابہام نہ ہو، کسی قسم کا التباس نہ ہو۔ اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب کی اس خصوصیت کو مختلف مقامات پر واضح کر دیا۔ مثلاً سورۃ النحل میں ہے:۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ..... (۱۶/۸۹)

اے رسول! ہم نے تم پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو اپنی ہر بات کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیتی ہے۔

(۳) خدا کی اس حکومیت کا سلسلہ تو شروع سے جاری تھا لیکن چونکہ اُن (ابتدائی) ادوار میں نہ انسانی ذہنوں میں ہنوز پختگی آئی تھی، نہ ان کے علم اور تجربہ میں وسعت پیدا ہوئی تھی، اس لئے انہیں زیادہ تر وقتی اور عارضی احکام دیئے جاتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ ان کی طرف جلدی جلدی رسول بھیجے جاتے تھے اور ان رسولوں کا دائرہ کار بھی محدود ہوتا تھا۔ جب مشیت کے پروگرام کے ماتحت انسانیت پختگی کے دور میں پہنچ گئی (یوں کہیئے کہ جب بچہ جوان ہو گیا) تو خدا کی طرف سے ایک ایسا ضابطہ آئین و قوانین نازل کر دیا گیا جو عالمگیر انسانیت کے لئے بھی کافی ہو اور آنے والے تمام زمانوں کے تقاضوں کو بھی محیط ہو۔ وہ ہر طرح سے مکمل ہو اور اس میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ پڑے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو نازل کر دینے کے بعد فرمایا کہ:۔

آخری کتاب

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ..... (۶/۱۱۶)

تیرے رب نے جو کچھ انسانوں سے کہنا تھا اسے اس کتاب میں مکمل کر دیا گیا ہے۔ نیز اس میں مندرج قوانین میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی بھی ضرورت نہیں ہو گی۔ اس لئے کہ یہ ضابطہ قوانین اس خدا کی طرف سے نازل کردہ ہے جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

یعنی اس ضابطہ قوانین میں نہ کسی اضافے کی ضرورت ہو گی اور نہ ہی کسی قسم کے تغیر و تبدل کی۔ اس کے بعد ایک ہی سوال باقی رہ جاتا تھا کہ اگر کسی وقت یہ کتاب حوادث ارضی و سماوی سے ناپید ہو گئی، یا اس میں کسی نے تحریف کر دی، تو پھر کیا صورت ہو گی۔ فرمایا کہ اس کا امکان ہی نہیں۔ اس لئے کہ:۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔ (۱۵/۹)

ہم نے ہی اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمے دار ہیں۔ اس میں نہ تحریف ہو سکے گی اور نہ ہی یہ ضائع ہو گی۔

یعنی قرآن مجید خدا کا مکمل ضابطہ قوانین ہے جس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور یہ غیر محرف بھی رہے گا اور محفوظ بھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب کے بعد خدا کی طرف سے کسی رسول کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ختم نبوت اس کا لازمی اور فطری نتیجہ تھا۔

(۵) ہم نے دیکھا ہے کہ دین، مذہب کی طرح خدا اور بندے کے درمیان کسی پرائیویٹ عقیدے کا نام نہیں جو انسانوں

کے خود ساختہ تصور کی رو سے پوجا پاٹ، بھگتی یا پرستش کے ذریعے قائم ہو سکتا ہے۔ دین انسانوں کی اجتماعی نظامِ زندگی کا نام ہے۔ جس میں خدا کی کتاب کی محکومیت اختیار کی جائے۔ جب ہم نظامِ زندگی یا حاکمیت اور محکومیت کے الفاظ بولتے ہیں تو اس سے لازماً ایک نظامِ حکومت یا مملکت کا تصور سامنے آتا ہے۔ مملکت کے بغیر کسی کتاب کی حکومت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس

مملکت کی ضرورت

حقیقت کو قرآنِ مجید نے یہ کہہ کر خود واضح کر دیا کہ دین کا تمکن اسی صورت میں ممکن ہے جب دین کے ماننے والوں کو ملک میں حاصل ہو۔ سورۃ النور میں ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ۔ (۵۵)

جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں گے اور صلاحیت بخش کام کریں گے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین پر اقتدار عطا کرے گا جس طرح اقوامِ سابقہ کی صورت میں کیا گیا تھا تاکہ اس طرح وہ دین متمکن ہو سکے جسے اس نے ان کے لیے منتخب کیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ جماعتِ مومنین کی اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین کا تمکن ممکن ہی نہیں۔ بات بالکل واضح ہے۔ دین کے تمکن کے معنی ہیں کتاب اللہ کی حکومت قائم ہونا اور حکومت لامحالہ اپنی آزاد مملکت ہی میں قائم ہو سکتی ہے! ——— آج کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ آئینِ پاکستان اسی صورت میں کارفرما ہو سکتا ہے جب مملکتِ پاکستان موجود ہو۔

ضمناً مندرجہ بالا آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جس مملکت میں دین کا تمکن مقصود ہو، وہ ظلم اور استبداد، دھاندلی اور سلب و نہب سے حاصل نہیں کی جاتی۔ وہ خدا کی حاکمیت پر ایمان اور اس کے مطابق صلاحیت بخش پروگرام کی رو سے حاصل ہوتی ہے۔ بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ دین کا تمکن ——— یعنی کتاب اللہ کی حکومت ——— اپنی آزاد مملکت ہی میں ممکن ہے۔ سورہ الحج میں ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ...... (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے جن امور کو کتاب اللہ نے جائز قرار دیا ہے انہیں حکماً نافذ کریں گے۔ جنہیں اس نے ناجائز ٹھہرایا ہے ان پر پابندی عائد کریں گے۔ مختصراً یہ کہ ان کا ہر معاملہ انجام کار خدا کے قوانین کے مطابق طے پائے گا۔

اس مقام پر ایک بڑا اہم اور غور طلب نکتہ سامنے آتا ہے۔ ہمارے مفسرین نے قرآنِ مجید کی سورتوں کو مکی اور مدنی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہم ان کے معیارِ تقسیم کے متعلق تو سردست کوئی بات نہیں کرنا چاہتے لیکن اس اہم حقیقت

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ مکی آیات کی سورتوں میں کہیں "يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" (اے جماعتِ مومنین) نہیں آیا۔ يايها الناس۔ (اے لوگو!) ہی آیا ہے۔

"یایھا الذین امنوا" مدنی آیات ہی میں آیا ہے۔ مکی زندگی میں اکثر حضرات اسلام لے آئے تھے۔ لیکن چونکہ ان کی زندگی ہنوز انفرادی تھی اس لئے انہیں "یایھا الذین امنوا" کہہ کر مخاطب نہیں کیا گیا۔ مدنی زندگی میں جب انہیں اقتدار حاصل ہو گیا اور انہوں نے اپنی مملکت قائم کر لی تو اس وقت "یایھا الذین امنوا" کے مخاطب

کے اہل قرار پائے۔ اس سے واضح ہے کہ ارباب ایمان "یا یہا الذین امنوا" کہہ کر پکارے جانے کے سزاوار اس وقت ہوتے ہیں جب انہیں اقتدار حاصل ہو جائے اور وہ کتاب اللہ کی حکومت قائم کر سکیں۔ اسی کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، خدا پر ایمان کا عملی مفہوم کتاب اللہ کی حاکمیت ہے۔ یہی کفر اور ایمان میں حدِ امتیاز ہے۔ جیسا کہ اس نے کہا ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ "جو کتاب اللہ کی حاکمیت قائم نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔"

سب سے پہلے اس قسم کی مملکت نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں مدینے میں قائم ہوئی اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے ارشاد فرمایا کہ :۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ (۵/۴۸)

اے رسول! تم ان لوگوں کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔

اور وحیِ خداوندی نے حضورؐ کی لسانِ مبارک سے یہ اعلان کرایا کہ :۔

أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۔ (۶/۱۱۵)

اے لوگو! (جو انسانوں کی حکومت کے خوگر ہو چکے ہو) کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی خدا کو چھوڑ کر انسانی حاکم تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو اپنی ہر بات کو نکھار کر بیان کر دیتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ وہ جو (آیت ۳/۷۹ میں) کہا گیا تھا کسی نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر اپنی حاکمیت قائم کرے، نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے اس طرح واضح الفاظ میں اس کا اعلان کرا دیا۔ بلکہ یہاں تک کہلا دیا کہ :۔

قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ .... (۶/۱۵)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی خدا کے کسی حکم کی نافرمانبرداری کروں تو میں بھی اس کے عذابِ الیم سے ڈرتا ہوں۔

غور فرمایئے کہ حضور نبی اکرمؐ کو مثال کے طور پر پیش کر کے انسانوں پر انسانی حکومت کے تصور کی کس طرح جڑ کاٹ کر رکھ دی۔!

(۱) یہاں تک یہ واضح ہو گیا کہ نظامِ خداوندی میں، جسے الدین کہا جاتا ہے، حکومت صرف کتاب اللہ کی ہو سکتی ہے۔ لیکن کتاب اللہ کی صورت یہ ہے کہ اس میں متعین احکام تھوڑے سے ہیں اور زندگی کے باقی معاملات کے متعلق صرف اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں جنہیں "حدود اللہ" کہہ کر پکارا گیا ہے اور جماعتِ مومنین کا فریضہ ان حدود کا تحفظ قرار دیا گیا ہے

حُدُودُ اللّٰه

(وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللّٰهِ ۔ (۹/۱۱۲)۔ ان اصول و اقدار کو حدود کہنے میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ جس کتاب کو تمام زمانوں اور تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطۂ حیات اور آئینِ زندگی قرار پانا تھا، اسے ہونا ہی ایسا چاہیئے تھا کہ اس میں ابدی مستقل، غیر متبدل حدود متعین کر دیئے جاتے۔ اور اس کتاب کی حاکمیت قائم کرنے والوں کو اس کی آزادی ہوتی کہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے جزئی قوانین اور وقتی

احکام خود متعین کریں۔ یہ جزئی قوانین حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے اور خدا کی مقرر کردہ حدود اپنی جگہ محکم اور غیر متبدل رہیں گی۔ اگر اس کتاب میں جزئی قوانین بھی خود ہی متعین کر دیئے جاتے تو یہ کتاب عالمگیر انسانیت اور زمانے کے بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکتی۔ جزئی قوانین ابدی اور غیر متغیر ہو نہیں سکتے۔

حدود اللہ کے علاوہ، قرآنِ مجید میں جو چند احکام آئے ہیں وہ بھی ابدی ہیں، لیکن ان کے متعلق قرآنِ کریم نے حکمت ملحوظ رکھی ہے کہ جن حالات میں انہیں نافذ کیا جائے گا اور جس طریق سے ان پر عمل پیرا ہو جائے گا، انہیں قرآن نے خود متعین نہیں کیا۔ ان حالات کی روشنی میں طریقِ کار کا تعین ہر دور کی قرآنی مملکت خود کرے گی۔

(۸) یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان جزئی قوانین کا تعین کس طرح سے کیا جائے گا۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے خود ہی طے فرما دیا کہ یہ کچھ جماعتِ مومنین کے باہمی مشورہ سے کیا جائے گا۔ آپ غور فرمایئے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے نظامِ مشاورت کا تصور ہی نہیں، اس کے قیام کا حکم دینا کیسی عظیم حکمتِ بالغہ ہے۔

نظامِ مشاورت

ضمناً۔ آج کل عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مغربی نظامِ جمہوریت کے دلدادہ اس نظام کی تائید میں قرآن کے نظامِ مشاورت کو بطور سند پیش کر دیتے ہیں۔ انہیں کون بتائے کہ قرآن کے نظامِ مشاورت اور مغرب کے جمہوری نظام میں کفر اور اسلام کا فرق ہے۔ قرآن کے نظامِ معاشرت میں یہ مشاورت قرآن کی قائم کردہ غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی کارفرما ہو سکتی ہے۔ لیکن مغربی نظامِ جمہوریت میں قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کی حدود اور قیود عائد نہیں ہوتے۔ اس میں اکثریت کا فیصلہ حق قرار پاتا ہے۔ یہاں ایک بڑا بصیرت افروز نکتہ سامنے آتا ہے۔ سورۃ انعام کی دو آیات پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ یعنی آیت (۶/۱۱۵) جس میں یہ کہا گیا کہ خدا کے سوا کوئی حاکم تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور اس نے اپنی حاکمیت کے لئے مفصل کتاب نازل کر دی ہے۔ اس کے ساتھ آیت (۶/۱۱۶) میں کہا گیا کہ یہ کتاب مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ ازاں بعد خدائے سمیع و علیم نے فرمایا:۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۔ (۶/۱۱۶)

اگر تو اکثریت کا اتباع کرنے لگ جائے تو وہ تجھے خدا کے راستے سے گمراہ کر دیگی۔ جو لوگ (وحی کی قیود کو اپنے اوپر عائد نہیں کرتے) وہ حق و صداقت کی نہیں بلکہ ظن و قیاس کی پیروی کرتے ہیں۔

آپ دیکھیے کہ خدائے سمیع و علیم نے کس طرح چودہ سو سال پہلے موجودہ دور کے نظامِ جمہوریت کو باطل اور گمراہ کن قرار دے دیا۔ بلا حدود و قیود قانون سازی کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسانوں کو اس قسم کے اختیارات کا حامل تسلیم کر لینا انہیں مقامِ الوہیت عطا کر دینا ہے جو شرکِ عظیم ہے۔ قرآن حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے مشاورت کی اجازت دیتا ہے۔

(۹) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ پہلی قرآنی مملکت رسول اللہ نے قائم فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم دیا گیا کہ:۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳/۱۵۹)

مملکت کے معاملات میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو۔

یہ ظاہر ہے کہ جو معاملہ باہمی مشورہ سے طے کیا جائے گا وہ احکامِ خداوندی کی طرح غیر متبدل نہیں ہو سکتا۔ اول تو وہی مجلسِ مشاورت

جس نے ایک فیصلہ کیا تھا، مزید غور و فکر کے بعد، یا حالات کی تبدیلی کے تقاضے کے تحت خود اپنے فیصلہ میں تبدیلی کر سکے گی یا بعد میں آنے والی مجلسِ مشاورت ایسا کرنے کی مجاز ہوگی۔ اس طرح حدود اللہ تو اپنے مقام پر محکم، اٹل اور غیر متبدل رہیں گی اور ان کے اندر رہتے ہوئے جو کچھ باہمی مشاورت سے طے پائے گا وہ قابلِ تغیر و تبدل ہوگا۔ یہ نظام نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے سچے جانشینوںؓ کے زمانے میں قائم رہا اور مشاورت سے طے پائے ہوئے امور میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ قرآن کے اسی نظام کا نام استخلاف فی الارض یا اسلامی مملکت ہے۔ قرآن کا منشا یہ تھا کہ امتِ مسلمہ میں یہ نظام اسی طرح مسلسل قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ کر دیا تھا کہ دیکھنا کہیں اس رسول کی وفات کے بعد پھر سے اُس نظامِ کہن کی طرف نہ پلٹ جانا جس میں خدا کے بجائے انسانوں کی حکومت قائم ہوتی تھی۔ (۳/۱۴۴)

اسلامی مملکت کے عناصر

آگے بڑھنے سے پیشتر اس نظام یا مملکت کے بنیادی عناصرِ ترکیبی ایک بار پھر سامنے لے آئیے۔ یعنی :-

(۱) اُن لوگوں پر مشتمل ایک امت جن کا ایمان یہ تھا کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے اور اس کی یہ حکومت اس کی کتاب کی رُو سے قائم ہوتی ہے۔

(۲) اس کتاب میں نازل کردہ احکام و اصول و اقدار جنہیں حدود اللہ کہا جاتا ہے، ابدی اور غیر متبدل ہیں اور ان کی روشنی میں جزئی احکام و قوانین امت کے باہمی مشورے سے طے ہوں گے۔

(۳) جو کچھ اس طرح سے طے پائے گا وہ اس حکومت کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے نافذ ہوگا۔ ان احکام کو احکامِ شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے گا۔ اس حکومت کے سوا کسی کو نہ کسی قسم کے احکام وضع کرنے کا حق حاصل ہوگا نہ نافذ کرنے کا اختیار۔

(۴) یہ احکام تمام افرادِ امت پر یکساں نافذ ہوں گے اور انسانی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہوں گے۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے اس امت میں نہ الگ الگ فرقے ہوں گے نہ ان فرقوں کے ایک دوسرے سے الگ قوانین۔ نہ ان میں مختلف مقننین کا وجود ہوگا نہ ان کی مرتب کردہ الگ الگ فقہیں۔ ایک امت، ایک ضابطہ ہدایت، ایک مملکت اور اس کی طرف سے نافذ کردہ ایک ضابطہ قوانین۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے صدرِ اول کی کوئی مستند اور مصدقہ، بلکہ قابلِ اعتماد تاریخ ہمارے پاس نہیں۔ اُس دور کی سب سے پہلی جامع تاریخ تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئی جسے طبرستان کے ایک مؤرخ (امام طبری) نے کسی تحریری مواد کے بغیر زبانی روایات سے جمع اور مدوّن کیا۔ بنا بریں تاریخی طور پر تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ نظامِ مملکت کتنے عرصے تک قائم رہا لیکن ایک بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ حضور نبی اکرمؐ اور آپؐ کے رفقاء کرامؓ (جنہیں صحابہؓ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کے دور حکومت تک یہ نظام قائم تھا کیونکہ اس امر کی شہادت قرآن میں موجود ہے کہ وہ مومنِ حقہ تھے اور مومنِ حقہ انہی کو کہا جاتا ہے جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کریں۔ اس کے بعد بنو امیہ کے زمانے میں بھی دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے عہد میں امت میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا تھا — اہلِ تشیع کی حیثیت ایک سیاسی گروہ کی سمجھ لیجئے کیونکہ اُس زمانے میں ان کی کوئی الگ فقہ وجود میں نہیں آئی تھی۔ اور دوسری بات یہ کہ اُس زمانے میں قرآن مجید کے سوا قانون (فقہ) کی کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اُس زمانے تک امت، امتِ واحدہ تھی۔ نہ اس میں مذہبی فرقے وجود میں آئے تھے نہ ان کی الگ فقہیں مرتب ہوئی تھیں۔ یہ کچھ ان کے بعد عباسیوں کے زمانے میں ظہور میں آیا۔ (واضح رہے کہ جو کچھ ہم نے بنی امیہ کے زمانے

کے متعلق لکھا ہے وہ ہمارا تاریخی اندازہ ہے جس کی صحت پر ہم اصرار نہیں کر سکتے ۔ نہ ہی اسے ہمارے پیشِ نظر موضوع سے خاص تعلق ہے ۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ قرآنی نظامِ مملکت کچھ عرصے تک قائم رہا اور اس کے بعد اس میں تبدیلی آگئی ۔

(۰)

(۱) پہلے کہا جا چکا ہے کہ دین کا تمکن، قرآنی نظامِ مملکت کے ساتھ مشروط اور وابستہ ہے ۔ یہ نظام نہ رہے تو معاشرہ میں دین کا وجود ہی نہیں رہتا ۔ جب قرآنی نظامِ حکومت کی جگہ ملوکیت آگئی (اور ملوکیت بھی اپنی بدترین شکل ۔ یعنی موروثی بادشاہت کے پیکر میں) تو دین باقی نہ رہا ۔ اس کی جگہ مذہب نے لے لی ۔ اس کے بعد تاریخ کے اس پورے دور میں (یعنی اس زمانے سے لے کر آج تک) مسلمانوں کی حکومتیں تو قائم ہوتی رہیں لیکن اسلامی حکومت کہیں بھی قائم نہ ہوئی ۔ ملوکیت نے سب سے پہلے ثنویت کی طرح ڈالی یعنی امورِ مملکت (جنہیں موجودہ دور کی اصطلاح میں پبلک لاء کہا جاتا ہے) حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھے اور شخصی قوانین اربابِ مذہب کی تحویل میں دے دیئے ۔ مسلمان بادشاہ ، امورِ مملکت کے متعلق جو فیصلے کرتے انہیں وہ اسلام کا نام دے دیا کرتے تاکہ عوام مطمئن رہیں کہ اسلامی حکومت قائم ہے ۔ اس تاثر کو ہمارے علمائے کرام کی تائید اور بھی تقویت پہنچاتی تھی ۔ وہ ان موروثی بادشاہوں کے حق میں محراب و منبر سے اید اللہ بنصرہ اور خلد اللہ ملکہٗ کی دعائیں مانگا کرتے تھے ۔ انہیں ظل اللہ علی الارض ۔ " زمین پر خدا کا سایہ " کہہ کر پکارا کرتے تھے ۔ ملوکیت کے اس ماحول میں امورِ مملکت کے متعلق جس قسم کے فتاویٰ صادر ہوا کرتے تھے اس کا اندازہ اس ایک فتویٰ سے لگا لیجئے جو فقہ حنفی کی مستند کتاب (ہدایہ اولین مجیدی ۔ ص ۵۴۹) میں ان الفاظ میں درج ہے ۔

موروثی بادشاہتیں

کل شیء صنعه الامام الذی لیس فوقه امام فلاحد علیه الا قصاص ۔

یعنی جن جرائم کی سزا حد ہے سربراہِ مملکت سے ان میں سے کسی کا مواخذہ نہیں کیا جا سکتا بجز قصاص کے ۔ یعنی سربراہِ مملکت پر قصاص کے سوا کسی جرم پر حد نہیں لگ سکتی ۔ جہاں تک شخصی قوانین کا تعلق ہے چونکہ ان کی تدوین و تنفیذ کے لئے کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں تھی ، اس لئے مختلف فقہا نے اپنے اپنے طور پر قوانین مرتب کر لئے ۔ اور ان کے معتقدین نے ان قوانین کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے لیا ۔ اس طرح یہ امتِ واحدہ فرقوں میں بٹ گئی ۔ ان ائمہ فقہا کی تعداد تو بہت زیادہ تھی لیکن ان میں سے چار نے بڑی شہرت حاصل کی ۔ یعنی :-

ائمۂ فقہاء

(۱)	امام اعظمؒ (کوفی)	پیدائش ۸۰ھ	، وفات ۱۵۰ھ
(۲)	امام مالکؒ (یمنی ، مدنی)	پیدائش ۹۳ھ	وفات ۱۷۹ھ
(۳)	امام شافعیؒ (عسقلانی ۔ مکی)	پیدائش ۱۵۰ھ	وفات ۲۰۴ھ
(۴)	امام احمد بن حنبلؒ (بغدادی)	پیدائش ۱۶۴ھ	وفات ۲۴۱ھ

(اہلِ تشیع کی فقہ جعفری ان سے الگ ہے) ۔

شروع شروع میں تو ان ائمہ فقہا کے متبعین اپنے اجتہاد سے ایسے مسائل بھی وضع کرتے تھے جو ان کے پیشروؤں کے خلاف ہوں ۔ نیز انہی کے مرتب کردہ مسائل کی فہرست میں حک و اضافہ بھی کرتے رہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور عقیدہ یہ پیدا ہو گیا کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ کسی مسئلہ میں ایسی بات کہے جو اس قول کے مخالف ہو جس کا

فتویٰ اس کے امام نے دیا ہے۔ چنانچہ فقہاء حنفیہ کے پیشوا اور مسلّم امام، ابوالحسن عبیداللہ الکرخیؒ نے یہاں تک کہہ دیا کہ:-

> ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو مؤوّل ہے یا منسوخ۔ اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ مؤوّل یا منسوخ ہے۔[1]

اجتہاد کا دروازہ بند کر دینے کے بعد اُس وقت تک کے دیئے گئے فتاویٰ کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا گیا۔ ان مجموعوں کا نام فقہ حنفی ہے۔ واضح رہے کہ یہ فقہ، امام ابوحنیفہؒ کی مرتب کردہ نہیں۔ یہ حنفی مسلک کے مختلف فقہا کے فتاووں کا مجموعہ ہے۔ انہی فتاویٰ کا ایک جامع مجموعہ شہنشاہ عالمگیرؒ کے زمانے میں مرتب کیا گیا جو فتاویٰ عالمگیری کے نام سے مشہور ہے۔

مذہب کی حیثیت سے (یعنی دینی حیثیت سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے) ان فقہی احکام کی ایک اہمیت ضرور تھی اور وہ یہ کہ کم از کم ایک فقہ کے مقلد ایک مسلک سے منسلک رہتے تھے۔ لیکن اسے دینی حیثیت تو کسی صورت میں بھی نہیں دی جا سکتی۔ دین کا تمکن تو اسی دن ختم ہو گیا تھا جب قرآنی نظامِ مملکت باقی نہ رہا تھا۔

دینی نقطۂ نگاہ سے اس میں ایک اور بنیادی خرابی تھی اور وہ یہ کہ انسانوں کے وضع کردہ ان قوانین کو درجۂ الوہیت[2] دے دیا گیا۔ یہ نکتہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قوانینِ خداوندی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ یہ حیثیت انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو دے دی جائے تو یہ انہیں خدائی حیثیت دے دینے کے مرادف ہوگا۔ قرآنِ کریم نے سابقہ اہلِ کتاب کے خلاف جو یہ اعتراض کیا ہے کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (9/31)۔ کہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو خدائی درجہ دے دیتے تھے تو اس سے یہی مراد ہے کہ وہ ان کے وضع کردہ قوانین کو خدائی قوانین جیسا درجہ دے دیتے تھے اور یہ کھلا ہوا شرک تھا۔ قرآنِ کریم نے امت میں فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے (30/32)۔ فرقے کا وجود اس عقیدہ پر قائم ہوتا ہے کہ اسکے متبعین اپنے فرقے کے بانیوں کے وضع کردہ عقائد و احکام کو منفرد، ابدی اور غیر متبدل سمجھتے ہیں۔ کوئی دس سال اُدھر کی بات ہے کہ ہمارے ہاں یہ خیال ابھرا کہ مروجہ اسلامی احکام کے متعلق کچھ تحقیقاتی کام کیا جائے۔ اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد تھانوی نے ارشاد فرمایا کہ:-

> یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمۂ ھدیٰ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے .... لہٰذا اگر تحقیقات اسلامیہ سے ایسے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور تنقیح شدہ موجود ہیں تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلاضرورت ہے اور اگر وہ تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر امتِ محمدیہ کا

---

[1] "تاریخ التشریع الاسلامی۔ مؤلفہ علامہ محمد الخضری کا اردو ترجمہ ـ "تاریخ فقہ اسلامی"
شائع کردہ: دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ صفحہ 421

[2] ائمہ فقہ کی تفقہی قابلیت مسلّم۔ ان کا تقویٰ اور دیانت بھی شک و شبہ سے بالا۔ لیکن اس کے باوجود وہ تھے تو انسان ہی۔ انہیں مقامِ انسانیت سے بلند تصور کر کے الوہیت کے درجہ پر سرفراز کر دینا، وہ غلو فی الدین ہے جس سے قرآنِ کریم نے سختی سے منع کیا ہے۔

اجماع ہے۔ (بحوالہ ایشیا۔ ۴ راگست ۱۹۶۸ء)

یہ ہے فقہی قوانین کے متعلق وہ عقیدہ جو مسلسل چلا آرہا ہے۔

(۰)

اقبالؒ کی نگہ بصیرت

(۱۰) یہ صورت صدیوں سے مسلسل چلی آرہی تھی کہ فطرت کی کرم گستری سے ہمارے ہاں ایک ایسا دیدہ ور پیدا ہوا جو اقبالؒ کے نام سے معروف ہے۔ اس کی نگہ بصیرت نے جب "عالم اسلام" (یعنی مسلمانوں کے ممالک) پر غور کیا تو اس نے دیکھا ان میں کسی جگہ بھی نہ اسلامی حکومت قائم ہے نہ اسلام اپنی صحیح شکل میں کارفرما۔ یہاں خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے رکھی ہے اور دین کی جگہ مذہب نے۔ اس نے اس کے خلاف جہاد کا عزم کیا اور ساری عمر اس پر قائم رہا۔ اس نے دیکھا کہ ان تمام خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے رکھی ہے۔ (خلافت سے مراد ہے قرآنی نظامِ حکومت جو صدرِ اول میں قائم ہوا تھا) چنانچہ اس نے سب سے پہلے اس کے خلاف نعرہ بلند کیا اور کہا کہ :-

خلافت بر مقامِ ما گواہی است — حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ — خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

(ارمغانِ حجاز۔ ص ۱۲۶)

اگلے صفحے پر لکھتے ہیں :-

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است — نظامش خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم — کہ در دینش ملوکیت حرام است

یہ بہت بڑا انقلابی نعرہ تھا اور عرب و عجم کے خلاف اعلانِ جنگ۔ اسے اس کا پورا پورا احساس تھا کہ اس اعلان کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسی بنا پر اس نے کہا تھا کہ :-

در افتد با ملوکیت کلیمے — فقیرے بے کلاہے، بے گلیمے
گہے باشد کہ بازیہائے تقدیر — بگیرد کارِ صرصر از نسیمے (ص ۱۲۷)

اسے معلوم تھا کہ اس انقلابی نعرہ کی مخالفت میں مذہبی پیشوائیت سب سے پہلے میدانِ کارزار میں سامنے آئے گی۔ اقبالؒ کے کلام میں ملّا کے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے وہ کسی خاص شخصیت یا گروہ کے خلاف نہیں۔ وہ مذہبی پیشوائیت کے مسلک اور وجود کے خلاف ہے جو صدیوں سے مسلمانوں کے غیر اسلامی نظام کو اسلامی کہہ کر پیش کر رہا تھا۔ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی مخالفت، اس جنگ کا منفی پہلو تھا۔ اس کے مثبت پہلو کے سلسلہ میں اقبالؒ یہ جانتا تھا کہ اسلامی نظام کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک اسے عملی شکل میں سامنے نہ لایا جائے۔ اور ایسا کیا جانا ایک ایسی آزاد مملکت ہی میں ممکن ہے جس میں پہلے سے کوئی نظام قائم نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مملکتِ پاکستان کا تصور دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس مملکت میں پہلا سوال یہ سامنے آئے گا کہ اس میں اسلامی قوانین کس اصول کے مطابق مدوّن کئے جائیں۔ اس سوال کے ضمن میں انہوں نے بڑی تفصیل سے گفتگو کی اور علاوہ دیگر مقامات، انہوں نے اپنے مشہور خطبات میں ایک پورا خطبہ اسی موضوع کے لئے وقف کر دیا۔ ہم اس خطبہ کے چیدہ چیدہ اقتباسات پیشِ ناظرین کرتے ہیں۔

خطبۂ اقبال کے اقتباسات

"اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں ـــ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ـــ تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصولِ حرکت کارفرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔"

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کلی اختیار۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"سُنّی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے لیکن ائمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا، آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانونِ شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا۔"

ہم اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے جنہیں علامہ اقبال نے اس جمود و تعطل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ وہ (اپنے اسی خطبہ میں) لکھتے ہیں:۔

"آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس، ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہنمائی سے ہمارے قدیم فقہا نے قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخِ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر

کامیابی حاصل ہوتی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا۔ کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں، اور دنیائے اسلام ان تمام نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشوونما سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، اکمل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرّا سمجھا؟ کبھی نہیں! اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقا ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہنمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔"

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ:۔

"قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا، جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ:۔

"تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔

تیرہویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔"

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افترا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افتراء" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔

علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں :۔

اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے رستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)۔

ارباب علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ یہ نظریہ کہ کسی ایک دور کے قوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہوتے ہیں، سب سے پہلے امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا اور یہ سن کر آپ کو شاید حیرت ہو کہ اس کی مخالفت امام اعظمؒ نے کی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے ان کی اس بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :۔

"امام شافعیؒ نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہد رسالت مآبؐ اور عہد صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقید نے مذہب حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصول قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتب فقہ جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصول فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہب فقہ اور تشریع کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔"

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں :۔

"لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے اُن فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہد رسالتمآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقامات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔"

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، علامہ اقبالؒ کو اس کا احساس تھا کہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان کے اس نظریے کی شدت سے مخالفت ہوگی چنانچہ انہوں نے لکھا :۔

"مجھے اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون سے متعلق ضخیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے دور حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیال کی تردید ہو جائے گی کہ اسلامی قانون جامد اور ناقابل ترقی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اٹھایا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجہ ناراضگی ہو جائے گا اور مخالفت کا دروازہ کھول

دے گا۔ بایں ہمہ، میں اس باب میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا۔"

اس سے بھی بہت پہلے انہوں نے (صوفی غلام مصطفےٰ تبسم (مرحوم) کے نام) اپنے ایک خط میں لکھا تھا:۔

"ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخرالذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے)، مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بڑے عالم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرضیکہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ "جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔" تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ امام اعظمؒ اپنے فتاویٰ کو کبھی ابدی اور غیر متبدل قرار نہیں دیتے تھے۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔

نصر بن محمد کہتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا کرتے تھے اور ہمارے ساتھ ایک شام کا آدمی بھی ہوتا تھا۔ جب وہ شامی (فراغت کے بعد) وطن کو واپس جانے لگا تو امام ابوحنیفہؒ سے رخصت ہونے کے لئے آیا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس سے پوچھا۔ "اے شامی! کیا تم اس کلام (فقہ) کو بھی اپنے ساتھ شام کی طرف لے جاؤ گے؟" شامی نے جواب دیا۔ "ہاں۔" اس پر امامؒ نے فرمایا۔ "خیال رکھنا۔ تم بڑے شر کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔" (خطیب ج ۱۳ صلک)۔ مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتویٰ دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں کیا یہ سب حق ہے جس میں شک شبہ کی گنجائش نہیں؟ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا۔ بخدا مجھے معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ باطل ہو اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام ابوحنیفہؒ فیصلے فرماتے، ہم ان کو لکھ لیا کرتے تھے امام زفرؒ کہتے ہیں کہ ایک دن امام ابوحنیفہؒ نے ابو یوسفؒ سے فرمایا۔ یعقوب! تیرا ناس ہو، جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری کچھ رائے ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابونعیمؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کو ابو یوسفؒ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو کیونکہ بخدا

مجھے خبر نہیں کہ میں (اپنے اجتہاد میں) خطاکار ہوں یا مصیب (ایضاً) سہل بن مزاحم کہتے ہیں کہ میں اکثر امام ابوحنیفہؒ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنتا تھا فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ۔ یعنی اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو بشارت دیدو جو باتوں کو سنتے ہیں اور پھر ان میں جو اچھی بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ (ایضاً۔ ج ۱۳۔ ص ۳۵۲) حسن بن زیاد لولوی کہتے ہیں کہ "ہمارا یہ قول (فقہ) ایک رائے ہے جو بہتر سے بہتر ہم قائم کر سکتے ہیں۔ جو ہمارے قول سے بہتر رائے لا سکے تو وہی صحت سے زیادہ قریب ہوگی۔" (ایضاً)

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ خود رسول اللہ کے زمانے میں جزئی قوانین باہمی مشاورت سے طے پایا کرتے تھے اور جو معاملات مشورے سے طے پائیں وہ ناقابلِ تغیر و تبدل قرار پا نہیں سکتے۔ اس ضمن میں بغدادی نے لکھا ہے کہ:۔

محمد بن موسےٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سنا کہ امام اعظمؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہ مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ اور ابو اسحٰق کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے سامنے اکثر نبیؐ کی حدیثیں آتیں اور وہ ان سے اختلاف کرتے۔

(بغدادی۔ جلد ۱۳۔ ص ۳۸۶)

آپ کے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادی نے لکھا ہے:

ابو عوانہ نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابوحنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابوحنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابوحنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچیے ورنہ امیر کے ہاں اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابوحنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گذر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔ (ایضاً۔ ص ۲۹۰)

امام اعظمؒ کے قول کا آخری ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ مجھے اس میں شک ہے کہ وہ ارشاد رسول اللہ کا ہے یا نہیں۔ آپ نے کہا یہ کہ اگر وہ رسول اللہ کا ارشاد تھا تو بھی وہ فیصلہ اس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں اس لئے اب فیصلہ موجودہ حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔

(۰)

اصولِ قانون سازی کے سلسلے میں جو کچھ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ ابدی اور غیر متبدل قرآنِ مجید کے احکام، اصول اور اقدار ہیں جنہیں وہ حدود اللہ کہہ کر پکارتا ہے۔ ہر اسلامی مملکت اس کی مجاز ہوتی ہے کہ وہ ان حدود کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق جزئی قوانین اور طریق کار خود متعین کرے۔ ایسا کرنے میں وہ سابقہ ادوار کے قوانین سے بطور نظائر استفادہ کر سکتی ہے لیکن وہ ان کی پابندی پر مجبور نہیں ہوتی۔ اس باب میں وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ایک قول نقل کرتے ہیں جو بڑا بصیرت افروز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر

استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، لیکن ان اصولوں کا نفاذ اُس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رُو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجاتے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ (خطبات۔ تشکیلِ جدید۔ چھٹا خطبہ)

اگر تشکیلِ پاکستان کے بعد علامہ اقبالؒ زندہ رہتے تو وہ اسی اصول کے مطابق قوانین مرتب فرماتے اور اس طرح صدرِ اول کے بعد ایک بار پھر مسلمانوں کی ایک مملکت کو صحیح معنوں میں اسلامی بنا دیتے۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ وہ اس سے بہت پہلے دنیا سے تشریف لے گئے اور اسلامی قوانین کے جس نظریہ اور مسلک کے خلاف انہوں نے اس قدر جہاد کیا تھا وہ یہاں غالب آگیا۔ اور اس خطۂ زمین کو اسلامی مملکت بنانے کا جو حسین خواب اقبالؒ نے دیکھا تھا، وہ خواب پریشاں بن کر رہ گیا۔ قوانینِ حدود کی جو پہلی قسط حال ہی میں نافذ ہوئی ہے وہ اس کی بدیہی شہادت ہے۔

حالیہ فقہی قوانین

کسی ایک دور کے حالات کے مطابق مرتب کردہ قوانین کو غیر متبدل قرار دے دینے میں بنیادی نقص یہ ہوتا ہے کہ وہ قوانین آنے والے زمانوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس لئے ان پر عمل کرنا یا کرانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ حالیہ قوانین میں سے تین (زنا، سرقہ اور قذف) کی سزائیں تو قرآنِ کریم کی مقرر کردہ ہیں لیکن ان جرائم کے ثبوت وغیرہ کی شرائط اور طریقِ کار فقہ کی رُو سے متعین کیا گیا ہے۔ اس طریقِ کار کی رو سے ان قوانین پر عمل درآمد میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں یا آئیں گی وہ قابلِ غور ہیں۔ مثلاً :-

(۱) ان جرائم کے اثبات کا مدار شہادات پر رکھا گیا ہے اور گواہوں کے متعلق شرط یہ ہے کہ وہ التزاماً سچے (TRUTHFUL) ہوں اور گناہ کبیرہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں (اسے فقہی اصطلاح میں تزکیۃ الشہود کہا جاتا ہے) فقہ کی رُو سے گناہ کبیرہ کی فہرست ایسی طول طویل ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو اس کی زد میں نہ آجاتا ہو۔ یہی شرائط جج کے لئے بھی ہیں جس زمانے میں یہ شرائط مقرر کی گئی تھیں، اُس میں حالات کیا تھے اس کا تو ہمیں علم نہیں، لیکن آج ہمارے معاشرے میں شاذونادر ہی کوئی ایسا شخص ملے جو ان شرائط پر پورا اترے۔ ظاہر ہے کہ اول تو تمام کے تمام، ورنہ ننانوے فیصد مقدمات اسی بنا پر خارج ہو جایا کریں گے کہ گواہان (اور اکثر و بیشتر جج صاحبان) تزکیۃ الشہود" کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ علاوہ ازیں، جس زمانے میں ہماری فقہ مرتب ہوئی تھی، تفتیشِ جرائم کا ذریعہ صرف گواہوں کی شہادات ہو سکتی تھیں۔ لیکن اب اس مقصد کے لئے انواع و اقسام کے سائنٹیفک طریقِ تفتیش ایجاد ہو چکے ہیں — ہاتھ پاؤں کے نشانات، خون کا تجزیہ، ڈاکٹری معائنہ، کپڑوں کی بُو وغیرہ — ان ذرائع کا سب سے بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان میں انسانی جذبات کی آلائش نہیں ہوتی۔ اللہ تعالےٰ نے عدل گستری کے طریقِ کار کو خود ہی اس لئے متعین نہیں کیا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ جوں جوں علمِ انسانی وسعت اختیار کرے گا، قسم قسم کے ذرائع تحقیق و تفتیش وجود میں آتے جائیں گے۔ اپنے آپ کو ان ذرائع کے فوائد سے محروم کر لینا منشائے خداوندی کے خلاف ہے۔

نیز، ملزم اگر مسلمان ہے تو گواہ بھی مسلمان ہونے چاہئیں۔ غیر مسلم ہے تو غیر مسلم۔

(۲) جرمِ زنا کے ثبوت کے لئے ایسے چار گواہوں کی شرط رکھی گئی ہے جنھوں نے عملِ دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ آج کا دور تو ایک طرف، ہماری ہزار سالہ تاریخ میں کوئی ایسا کیس دکھائی نہیں دیتا جس میں اس قسم کی شہادت پیش ہوئی ہو۔ علاوہ اس کے کہ اس قسم کی شہادات کا میسر آنا ناممکن ہے، اس میں ایک اور خطرہ بھی لاحق ہے۔ فقہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی مقدمہ میں (مثلاً) تین عینی گواہ ہوں اور چوتھا گواہ یہ کہہ دے کہ میں نے دخول کو تو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا البتہ اس مرد اور عورت کو ایک ہی لحاف میں لپٹے ہوئے دیکھا ہے تو یہ شہادت قابلِ اعتبار تصور نہیں ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملزم تو بری ہو جائے گا لیکن اول الذکر تین گواہوں پر قذف کی سزا وارد کر دی جائے گی کیونکہ انہوں نے ایک بے گناہ کے خلاف زنا کی تہمت لگائی ہے۔

زنا بالجبر میں یہ صورت اور بھی نزاکت اختیار کر جائے گی۔ مظلوم عورت ایک متعین مرد کے خلاف فریاد کرے گی اور جب وہ اس کے ثبوت میں چار عینی گواہ پیش نہیں کر سکے گی تو وہ مرد تو بے گناہ قرار پا جائے گا اور اس عورت پر حدِ قذف صادر ہو جائے گی۔

(۳) سرقہ کے جرم کے اثبات کے لئے اسی قسم کے دو گواہوں کی شرط لازم قرار دی گئی ہے۔ ان میں مدعی شامل نہیں ہوگا۔ اگر دو کی جگہ گواہ ایک ہی ہو تو جرم ثابت نہیں ہو سکے گا۔ دو گواہوں کے علاوہ کسی قسم کے تفتیشی ثبوت کی گنجائش نہیں رکھی گئی۔

(۴) ان تصریحات سے واضح ہے کہ فقہی طریقِ کار کی رُو سے شاید ہی کوئی جرم پایۂ ثبوت تک پہنچ سکے۔

اس مشکل کے حل کے لئے ان قوانین میں کہا گیا ہے کہ اگر اس طریق سے جرم ثابت نہ ہو سکے تو مروجہ قوانین کے مطابق مقدمہ کا فیصلہ کر دیا جائے۔ بالفاظِ دیگر کہا یہ گیا ہے کہ جب اسلامی قوانین مؤثر ثابت نہ ہوں کیونکہ وہ ناممکن العمل ہیں تو پھر انہی غیر اسلامی قوانین کی طرف رجوع کیا جائے جو اس وقت ملک میں نافذ ہیں اور جنھیں اسلامی قوانین سے بدلنے کے لئے اس قدر تگ و دو کی جا رہی ہے۔ سوچئے کہ اس سے دنیا اسلام کے متعلق کیا تصور قائم کرے گی۔ کیا اس کا یہ تأثر اور اعتراض موثق نہ ہو جائے گا کہ اب اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

یہ سب اس لئے ہے کہ ہم نے ہزار سال پہلے کے فقہا کے وضع کردہ قوانین کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔

(۵) ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ ان قوانین کی رُو سے جرائم پایۂ ثبوت تک پہنچ ہی نہیں سکیں گے تو یہ ہمارا ہی خیال نہیں، خود محترم صدرِ مملکت کو بھی اس کا احساس ہے جس کا اظہار انہوں نے پچھلے دنوں امریکہ کی ٹی۔ وی ٹیم کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا تھا۔ ٹی۔ وی ٹیم نے اعتراض کیا تھا کہ اس قسم کے قوانین کس طرح عدلِ انسانی کے مطابق کہلا سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں صدرِ محترم نے فرمایا تھا:

سوال: مغرب میں بعض لوگ مسلمانوں کو وحشی سمجھتے ہیں۔ مثلاً ان کے لئے یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دینا کس طرح عدلِ انسانی کہلا سکے گا؟

جواب: یہ ٹھیک ہے۔ میں اس کی وضاحت اس طرح کروں گا۔ اسلام تعذیب (PUNISHMENT) کے مقابلہ میں تخویف یا تہدید (DETERRENCY) پر زیادہ زور دیتا ہے۔ لیکن اگر آپ اس فلسفہ

پر نگاہ رکھیں جو ان (نام نہاد) سنگین سزاؤں (مثلاً ہاتھ کاٹ دینا یا ہاتھ اور پاؤں دونوں کاٹ دینا یا سنگسار کر دینا) کے پیچھے کارفرما ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس قانونِ شہادت کی رُو سے جس کا نفاذ کیا جا رہا ہے، ایک فی ہزار مجرموں کو بھی یہ سزائیں نہیں دی جا سکیں گی۔ اسلام صرف سزائیں مقرر نہیں کرتا۔ وہ پہلے یہ بھی متعین کرتا ہے کہ جو شخص ایسے مقدمات کے فیصلے کرے گا وہ کس قسم کا ہے۔ ان ججوں یا قاضیوں کے لئے جو اس قسم کے مقدمات کی سماعت کریں گے، بڑی کڑی شرطیں عائد کی گئی ہیں۔ وہ ایسا شخص ہونا چاہیئے جس کی سیرت اور کردار کے خلاف انگشت نمائی نہ کی جا سکے۔ اسے انتہائی دیانتدار ہونا چاہیئے۔ اسے اچھا مسلمان ہونا چاہیئے۔ اسے کسی کے خلاف تعصب نہیں ہونا چاہیئے۔ (یعنی اسے انتہائی غیر جانبدار ہونا چاہیئے)۔ یہ تو رہیں اس جج کی خصوصیات جو ایسے مقدمات کی سماعت کرے گا۔ جہاں تک ان شہادات کا تعلق ہے جو اثباتِ جرم کے لئے پیش کی جائیں، تو ان کے بارے میں بھی ایسی کڑی شرائط عائد کی گئی ہیں جن کی رُو سے کسی ایسے شخص کا مجرم قرار پا جانا ناممکن ہو گا جس کے ارتکابِ جرم کے بارے میں ذرا سا بھی شک و شبہ ہو۔ مثلاً گواہ کو عینی شاہد ہونا چاہیئے۔ وہ ایسا شخص ہونا چاہیئے جس نے ہمیشہ سچ بولا ہو۔ کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ جس کا کیریکٹر ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہو۔ نیز اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ملزم سے یہ جرم پہلی بار صادر ہوا ہے تو متعلقہ عدالت سزا کے تعین میں اس کا خاص خیال رکھے گی۔ اکثر احادیثِ نبویؐ میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب اس قسم کے جرائم کا مقدمہ سامنے آئے جو قطعِ ید وغیرہ سزاؤں کے مستوجب ہوں تو کوشش کرنی چاہیئے کہ کوئی ایسا عذر مل جائے جس کی روشنی میں نرم سزا دی جا سکے خواہ اس میں تھوڑا سا شک بھی کیوں نہ ہو۔ (یعنی ذرا سے شک کا فائدہ بھی ملزم کو ملنا چاہیئے)

سوال: اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ ان سزاؤں کا بنیادی مقصد تخویف ہے۔

جواب: یہ ٹھیک ہے۔ بنیادی مقصد تخویف ہی ہے۔ ان سزاؤں کے سلسلہ میں یہ وہ اہم پہلو ہے جس کے نظر انداز کرنے سے اہلِ مغرب کو غلط فہمی لاحق ہو جاتی ہے۔ وہ اسے بھول جاتے ہیں کہ قانونِ شہادت، ججوں کی تعیناتی، گواہوں کے متعلق شرائط۔ (یعنی) وہ پورے کا پورا ضابطہ جس کی رُو سے کسی ملزم کے مجرم یا بے گناہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا، ایسا سخت ہے کہ ایک ہزار میں سے بمشکل ایک مقدمہ ایسا ہو گا جس میں یہ انتہائی سزائیں دی جا سکیں گی۔

یعنی یہ نہیں کہ ان قوانین میں مقرر کردہ سخت سزاؤں کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ملک میں جرائم کا خاتمہ ہو جائے گا بلکہ یہ کہ یہ سزائیں دی ہی نہیں جا سکیں گی، اس لئے انہیں سنگین یا وحشیانہ قرار نہیں دیا جا سکتا!

یہ تو رہیں ان فقہی قوانین کے داخلی استقام کی مثالیں۔ جہاں تک ان کے عمومی اطلاق کا تعلق ہے، صورتِ حالات

فرقہ وارانہ اعتراضات

اس سے بھی کہیں نازک اور شدید ہے۔ آپ کسی فرقہ کی فقہ کے قوانین کبھی نافذ کر دیں، دوسرے فرقے انہیں کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ وہ ان کے خلاف احتجاج کو اپنا مذہبی تقاضا قرار دیں گے۔ مذہبی تقاضا کس قدر شدید ہوتا ہے، اس کا اندازہ ایک مثال سے لگا لیجئے۔ تشکیلِ پاکستان کے روزِ اول سے اس وقت تک ملک میں غیر اسلامی قوانین رائج چلے آ رہے ہیں۔ کسی فرقہ نے آج تک یہ نہیں کہا کہ ہم ان

قوانین کی اطاعت نہیں کریں گے۔ لیکن جونہی یہاں ایک فرقہ کے فقہی قوانین نافذ کئے گئے تو دوسرے فرقہ کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہو گئی کہ ہمارے لئے یہ قوانین قابلِ قبول نہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فرقہ وارانہ مذہبی تقاضوں کی شدت کیسی ہوتی ہے۔

(۰)

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، تشکیلِ پاکستان کے بعد اگر علامہ اقبالؒ ہم میں موجود ہوتے تو یہاں شرعی قوانین اُن کے پیش کردہ اصول کے مطابق آسانی سے مرتب ہو جاتے۔ اس اصول کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم تشتتِ فکر و نظر کا شکار ہو رہی ہے۔ پہلے یہ کہا گیا کہ یہاں کتاب و سنت کے مطابق قوانین وضع ہونگے۔ بیس برس کے بعد مودودی صاحب نے فرمایا کہ کتاب و سنت کی رُو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں کیا جا سکتا جو تمام فرقوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔ اس کا علاج یہ بتایا گیا کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔ غیر حنفی فرقوں نے اس کے خلاف شور مچایا تو بات دب گئی۔ اب جو قوانین نافذ ہوئے ہیں تو وہ فقہ حنفی پر متفرع ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کی مخالفت ہو رہی ہے بلکہ وہ ناممکن العمل بھی ہیں۔ فقہ کے متعلق خود مودودی صاحب کے جو خیالات ہیں ان کی روشنی میں سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے کیسے تجویز کر دیا کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔ ان کا ارشاد ہے:-

(۱) اس مسخ شدہ مذہبیت میں بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن بابت محرم سنہ ۱۳۷۰ھ)

(۲) مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو، زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات حصہ دوم۔ صفحہ ۴۲۶)

(۳) انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔ (تنقیحات۔ صفحہ ۱۲۰)

اس کے برعکس

تمام زمانی و مکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوندِ عالم ہے جس کے پاس حقیقی علم ہے، اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرا برابر کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ (تنقیحات۔ صفحہ ۱۲۰)

اور یہ علمِ خداوندی اس کی کتاب کے اندر محفوظ ہے۔ لہٰذا، وہی قوانین اسلامی بھی کہلا سکیں گے اور ممکن العمل بھی ہونگے جو خدا کی کتاب کی روشنی میں، اس اصول کے مطابق مرتب کئے جائیں جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے۔ اگر مختلف فرقے اس اصول کو تسلیم نہیں کرتے تو نہ متفق علیہ اسلامی قوانین مرتب ہو سکتے ہیں، نہ اسلامی مملکت وجود میں آ سکتی ہے۔

قرآنی قوانین

للہ الحمد کہ پرویز صاحب کی تازہ ترین تصنیف ــــ قرآنی قوانین ــــ ملک میں بیحد مقبول ہو رہی ہے اور اس کی افادی اہمیت نکھر کر سامنے آ رہی ہے اس سے نظر آتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔ اگر آپ نے اسے ابھی تک حاصل نہیں کیا تو جلدی منگوا لیجئے۔

قیمت فی جلد (مجلد) تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) ملنے کا پتہ

(۱) مکتبۂ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور۔ (۲) ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک

(جسے معلوماتِ عامہ کیلئے وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے۔)

جوں جوں ملک میں قرآنی فکر عام ہو رہی ہے، طلوعِ اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ بھی تیزی سے بڑھایا جا رہا ہے حتیٰ کہ بعض طبقوں میں اس کی شدت اشتعال تک پہنچا دی جاتی ہے۔ ہمیں اس پر کبھی اعتراض نہیں ہوا کہ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں اس سے اختلاف کیوں کیا جاتا ہے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ خدا کی طرف سے وحی ہے، جس سے کسی کو اختلاف کا حق حاصل نہیں۔ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں وہ قرآن کریم کی تعلیم کو سمجھنے کی انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں سہو بھی ہو سکتا ہے اور خطا بھی۔ جو شخص ہمیں ہماری کسی غلطی پر متنبہ کرتا ہے، ہم اس کے شکر گذار ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی بات کی تائید میں قرآن کریم کی سند رکھتا ہو، لیکن ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کرنے والوں کی کیفیت جُدا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ جو کچھ "طلوعِ اسلام" کہتا ہے اُسے اُس کے الفاظ میں اپنے قارئین یا سامعین کے سامنے پیش کر کے اس پر قرآن کریم کی روشنی میں تنقید کریں۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ایک غلط بات وضع کرتے ہیں، اور اسے طلوعِ اسلام کی طرف منسوب کر کے گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے "پرویزی فرقہ" کی ایک اصطلاح خود ہی وضع کر کے اسے عام کر رکھا ہے اور جس کے خلاف کچھ کہنا مقصود ہوتا ہے اس کے متعلق مشہور کر دیتے ہیں کہ وہ "پرویزی" ہے۔ حالانکہ اس فرقہ کا وجود ہی دنیا میں نہیں۔ پرویز صاحب اپنے آپ کو "قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم" کہتے ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ چالیس پچاس سال سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں۔ چونکہ ہماری قوم بھی عام طور پر سہل انگار واقع ہوئی ہے اس لئے کوئی اس بات کی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ جو کچھ طلوعِ اسلام یا پرویز صاحب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ انہوں نے کہا بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے ان مخالفین کا حربہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے کہ جو لوگ دیانتداری سے تحقیق کرنا چاہیں ان پر حقیقت واضح ہو جائے، ہم طلوعِ اسلام کے مقصد و مسلک کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں۔ ذیل میں ہم مختصر الفاظ میں اس مقصد و مسلک کو درج کرتے ہیں

(۰)

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک یہ ہے کہ:-

(۱) تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(۲) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ابد تک ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآنِ کریم خدا کی آخری کتاب اور حضورؐ رسالتمآب خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

(۳) قرآنِ کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق

کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے
(۴) کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابۂ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(۵) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہو سکتا۔

(۶) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت اُمت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(۷) رسول اللہؐ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر اُمت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(۸) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے اُمت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور، دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(۹) ہمارے لئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو اُمت کو احکام و قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہو گی۔

(۱۰) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہو گا۔ اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہو گا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کیلئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمد گر مدغم ہو جائیں گے۔

(۱۱) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اُسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما

ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۳) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے۔ اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

(۱۴) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(۱۵) ہم، رسول اللہؐ کے بعد، ہر قسم کے مدعیٔ وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقۂ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے۔ اور بلا ردّ و بدل ان کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مسلک، جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔

———(۰)———

جو حضرات طلوعِ اسلام کے اس مقصد سے متفق ہیں وہ مقامی طور پر اس فکر کے عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی اس تنظیمی کوشش کا نام ہے "بزمِ طلوعِ اسلام"۔ جو لوگ اس بزم کے ممبر بنتے ہیں ان سے کوئی نیا عقیدہ منوایا جاتا ہے نہ احکامِ خداوندی کے علاوہ کسی اور کی اطاعت طلب کی جاتی ہے۔ وہ کوئی الگ پارٹی بناتے ہیں۔ نہ عملی سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں۔ نہ وہ کسی کو اپنا پیر و مرشد سمجھتے ہیں نہ امیر و مطاع۔ یہ ان متفق الخیال احباب کی تنظیم ہوتی ہے جو یک نگہی و یکجہتی سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی کوشش کرتے ہیں، اس کے سوا ان کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ اور یہ جو کچھ کرتے ہیں اس میں نہ کوئی راز ہوتا ہے نہ پردہ۔ نہ ہی کسی قسم کی جلبِ منفعت۔

المختصر، مسلمانوں کے قلب و دماغ سے ہر قسم کے غیر قرآنی تصورات و نظریات اور معتقدات نکال کر ان کی جگہ خالص قرآنی تصورات پیش کرنا اور دلائل و براہین کی رو سے پیش کرنا طلوعِ اسلام کا مقصود و مطلوب ہے۔ اس میں وہ، قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو سب سے پہلے اپنے سامنے رکھتا ہے تاکہ، وہ مغربی سیکولرازم اور اشتراکیت کے سیلاب سے بچ کر پاکستان میں صحیح قرآنی معاشرہ قائم کرنے کے قابل ہو سکیں۔

اسلام کو علم و بصیرت کی روشنی میں سمجھنے کیلئے کتابیں

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی عرفِ ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علومِ حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک (مکمل سیٹ) ۱۲۰ روپے

معراجِ انسانیت

سیرتِ صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) خود قرآن کے آئینے میں۔ مفکرِ قرآن کا بلند پایہ شاہکار عقل و عشق، فکر و نظر، دل و دماغ کا حسین امتزاج اس سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے مقامِ محمدی اور انقلابِ محمدی نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ حسنِ معنوی کے ساتھ صوری پاکیزگی بھی دیدہ زیب۔ جلد مضبوط و دلکش۔ قیمت ۔/۴۵ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب، یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؛ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع۔ عمدہ سفید کاغذ۔ قیمت مجلد۔/۲۵ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

جہانِ فردا

مرنے کے بعد کیا ہوگا؛ زندگی کن مراحل سے گذرے گی؛ قیامت، حشر، نشر، میزان، جنت، جہنم کا قرآنی مفہوم کیا ہے؛ اس دنیا کا اُس دنیا کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ مُردوں کے لئے "ایصالِ ثواب" کی حقیقت کیا ہے؛ یہ اور اسی قسم کے دیگر متعدد سوالات کے بصیرت افروز جوابات۔

قیمت مجلد۔/۲۵ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے اسلام کے متعلق اس کے دل میں سینکڑوں شکوک اور شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اُسے کوسیئے نہیں یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ قیمت مکمل سیٹ۔/۳۶ روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں

وہ منفرد معلومات افزا کتاب جس کا پہلا ایڈیشن ایک عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا، دوبارہ شائع ہو گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر کے مذاہب کی معینہ آسمانی کتابیں کس طرح مرتب ہوئیں کن مراحل سے گذریں اور اب وہ کس شکل میں ہیں۔ اس کتاب سے جہاں ان مذاہب کے متعلق عجیب و غریب معلومات حاصل ہونگی وہاں مفکرِ قرآن کی وسعتِ مطالعہ اور عمیق تحقیق کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔

قیمت مجلد۔/۱۲ روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

ملنے کا پتہ: مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اُردو بازار لاہور — ادارۂ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور